# اُردو نثر کی داستان

ہر ماہ کی یکم تاریخ کو

مصر و یونان کے قصّہ گوؤں
سے چل کر گولکنڈہ و بیجاپور
کے داستان گوؤں تک

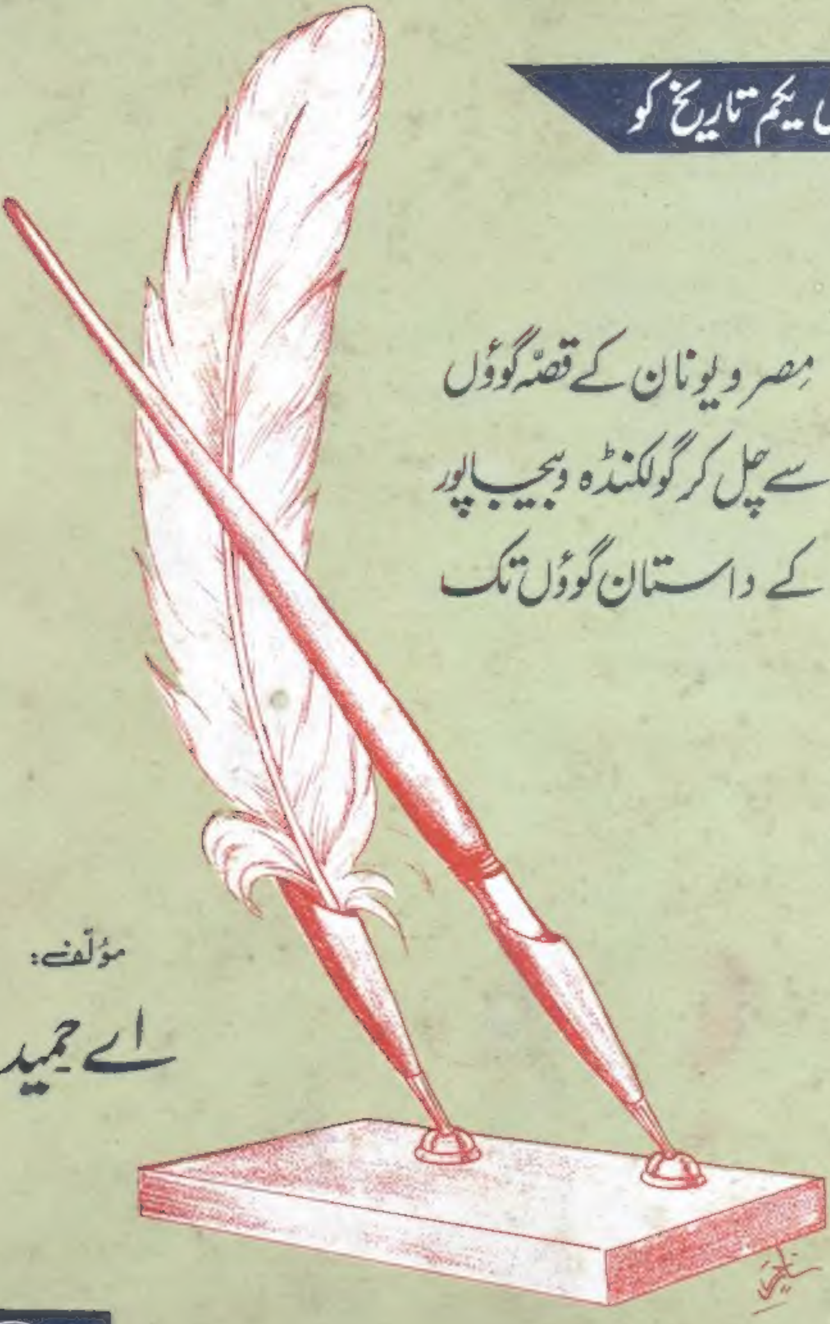

مؤلف:
اے حمید

روشن کتابیں ۲

مطبوعات شیخ غلام علی، اَدبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

اُردو ادب کے شائقین کے لیے روشن کتابوں کی ایک خصوصی پیش کش

اُردو نثر کا ایک مستند
تاریخی وادبی
سلسلہ

# اُردو نثر کی داستان

(مصر و یونان کے قصہ گوؤں سے چل کر گولکنڈہ و بیجاپور کے داستان گوؤں تک)

مؤلف:

## اے حمید


مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

دنیا کی ہر قومی اور علاقائی
زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد
مُدیر مسئول : ارشد نیاز
مُدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :
اے حمید - ایم ایس ناز
محمد حنیف شاہد - عینکاف خالد

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

ادارہ :
مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور
فون نمبر :
۵۲۹۰۸ ۶۱۸۵۹ ۴۱۳۰۲۰

تار :
کتاب مین (KITABMAN) لاہور

پیارے قارئین !

"روشن کتابوں" کے دو الگ الگ تاریخی و ادبی سلسلے "اُردو نثر کی داستان" اور "اُردو شعر کی داستان" کو ہر ادبی ذوق رکھنے والے قاری نے بے حد پسند کیا ہے خصوصاً اُردو ادب کے طالب علموں نے تو اسے ایک اہم تحقیقی کاوش قرار دیا ہے۔ اِس وقت ہم "اُردو نثر کی داستان" کی دوسری قسط پیش کر رہے ہیں۔ اِس کتاب میں مصر و یونان کے قصہ گوؤں سے چل کر گولکنڈہ اور بیجاپور کے داستان گوؤں تک کے تفصیلی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ داستان گوئی کی ایک پوری تاریخ سمو دی گئی ہے۔ داستان اور داستان گو کے بارے میں اے حمید کی یہ تحقیق یقیناً لافانی ہے۔ داستان کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔ فارسی، عربی، سنسکرت اور اُردو زبان میں داستانیں اپنے اپنے علاقوں کے ادبی سرمائے کے طور پر آج تک زندہ ہیں اور بے حد مقبول ہیں۔ پہلے صرف داستان گوئی کا رواج تھا، بعد میں داستانیں لکھی بھی جانے لگیں چنانچہ فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی داستانیں اُردو ادب کا ایک انمول خزانہ ہیں۔

قدیم داستانوں میں اکثر ہمیں ایسے واقعات ملتے ہیں جو مافوق البشر ہیں اور عام زندگی سے انھیں کوئی علاقہ نہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں ذہنی حظ کا ایک ایسا عنصر ضرور موجود ہے جو قاری کو انھیں پڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جنوں، پریوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے مافوق الفطرت واقعات اور دیو مالائی قصّے کہانیاں، آج بھی ہماری تنہائی کا بہترین مصرف ہیں۔

جناب اے حمید پوری محنت اور سرگرمی سے اِس اہم ادبی کام کو سرانجام دے رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں وہ داستان گوئی کی مکمل تاریخ کا زمانی اعتبار سے جائزہ لیتے ہُوئے اور یونان اور قدیم برِ صغیر کے داستانی اَدب کو سمیٹتے ہُوئے دکن کے داستان گوؤں تک پہنچے ہیں۔ بعض ضروری مباحث بھی چھیڑے ہیں جن سے داستان اور داستان گوؤں کے حالات پر تفصیل سے روشنی پڑتی ہے۔ اُنھوں نے بعض ایسے گمنام داستان گوؤں کا کھوج بھی لگایا ہے جن کی بیان کردہ داستانیں ادب میں ایک اہم مقام کی حامل ہیں۔ "نیل کے داستان گو"۔ "ایک سحر طراز داستان گو"۔ "موہنجوڈارو کا گمنام داستان گو" اور "کشمیر کا البیلا داستان گو" جیسے عناوین کے تحت اُنھوں نے ایسے ہی داستان گوؤں کا تذکرہ کیا ہے۔

قارئین ! "اُردو نثر کی داستان" کے ساتھ ہی ہم اے حمید کی ایک اور روشن کتاب "ڈھاکہ سے فرار" بھی پیش کر رہے ہیں۔ یہ آگ کے طوفان اور خون کے سیلاب سے زندہ بچ نکلنے کی ایک حیرت انگیز اور ڈرامائی داستان ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے —— !

نیاز احمد

# دیباچہ

قارئینِ کرام!

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ داستان پہلے پیدا ہوئی یا داستان گو پہلے نمودار ہوا، لیکن اتنا ہم ضرور وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انسان نے کہانی سنانے اور داستان بیان کرنے کے فن کو سب سے پہلے اپنایا۔ اُردو ادب کی نثر کا بیش قیمت حصّہ داستانوں سے بھرا ہُوا ہے۔ یہ داستانیں ہمیں فارسی، عربی اور سنسکرت سے بھی ملیں اور انھیں علاقائی آب و ہَوا نے بھی جنم دیا۔ سنسکرت کی قدیم ترین کہانیوں سے لے کر فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی داستانوں تک اردو ادب کا دامن انمول اور خوبصورت ترین داستانوں سے مالا مال ہے۔ ان ساری کی ساری داستانوں کی روایت ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہے۔ ان میں شہزادے ہیں، جن، پری زاد، اسمِ اعظم، نقش سلیمانی اور الواح ہیں، جادو گری کے کارنامے ہیں، فسانہ و افسوں ہیں، پری زادوں کے محل ہیں، اپنی محبوباؤں کی تلاش میں نکلے ہُوئے شہزادے اجنبی جزیروں میں پہنچ کر شعلے اگلتے اژدہوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں سنگین قلعوں کی دیواریں پھاندی جاتی ہیں۔ پچھلے پہر کی گھمبیر خاموشی میں راجکماریاں اپنے عاشقوں کے ساتھ محل کے خفیہ دروازوں سے فرار ہوتی ہیں۔ دیو مکھی بنا کر شہزادیوں کو قید کر کے رکھتے ہیں۔ جادو کے زور سے انسان ہاتھی بن کر جنگلوں میں نکل جاتے ہیں۔ اُلٹے پَیروں والی چڑیلیں پیچھے سے آوازیں دے کر سفر کرتے شہزادوں کو پتھر بنا کر رکھ دیتی ہیں اور سمندری طوفانوں میں ڈوبے ہوئے بحری جہاز ایک پل میں افسوں پھونکنے سے خشکی پر اتر جاتے ہیں۔

اِن سب محیّر العقول باتوں اور واقعات کے باوجود ہمیں ان داستانوں میں ایک درس ملتا ہے۔ وفا شعاری، ایثار پرستی اور عفت و حیا داری کا۔ انسانی اخلاق کی بلند اقدار کا اور انسان کے ساتھ گہری ہمدردی اور اٹوٹ انسانی رشتوں کا۔ زیرِ مطالعہ کتاب میں ہم نے داستانوں کی تاریخ کو پورے عالم انسانی میں پھیلا کر اسے مصر و یونان سے شروع کیا ہے اور داستان گوئی کی تاریخ کا عہد بہ عہد جائزہ لیتے ہوئے یونان اور قدیم برصغیر کے داستانی ادب سے ہوتے ہوئے دکنی داستان گوؤں تک آئے ہیں —— ہر عہد کے ساتھ آپ کو یورپی اور برصغیر کے نقادانِ فن کی کتابوں کے مستند حوالے ملیں گے۔ ان میں ایسی نایاب کتابوں کا بھی ذکر ہے جو گولکنڈہ اور بیجاپور کی لائبریریوں سے اغوا کر کے لندن کے پبلشروں کے پاس پہنچائی گئیں اور جن کے قیمتی صفحات پر لکھی ہوئی قدیم ترین داستانوں کو ہم اس کتاب میں نقل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ہم اس کتاب میں قدیم مصر سے لے کر دکنی ادب کی داستان گوئی تک آئے ہیں۔ اس سے اگلی کتاب میں ہم فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی وسطی ہند کی داستان گوئی کا تفصیلی جائزہ آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

رشد نیاز

# اُردو نثر کے مختلف اصناف


- قِصّہ گوئی ۔ داستانیں
- دیومالائی داستان
- نیل کے داستان گو
- ایک سحر طراز داستان گو
- داستان گو کا فرار
- داستان گو یونان میں
- داستان گو کا سفر ۔ یونان
- فیولبس کی قصہ گوئی
- فریانہ کی داستان
- محبوب کی سرگزشت
- داستان کا عروج
- داستان در داستان
- قِصّہ دریاکس کا
- دیومالائی اژدہا
- کہانیوں کے جزیرے
- ایک نئی داستان
- داستان کا سفر
- بیان کا جادو
- کہانی کا شاہ جنات
- یولی سیس کی داستان
- دیومالائی پنجرہ
- جن کے پنجے سے رہائی
- داستان کا انجام
- موہنجوڈارو کا گمنام داستان گو
- دیوتا اُشر کا انتقام
- آدھی رات کو ملاقات
- داستان کا نقطۂ عروج
- داستان کا انجام
- اُردو ادب میں داستان گوئی
- بوستان خیال کے
- کشمیر کا ایک البیلا داستان گو



# اُردو نثر کے مختلف اصناف


## قِصّہ گوئی ۔ داستانیں

اردو داستان نویسی کی تاریخ تقریباً دو سو سال پرانی ہے۔ اس سے پہلے برِصغیر پاک و ہند میں قِصّہ گوئی کا رواج عام تھا۔ قِصّہ گوئی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی تہذیب۔ دنیا کا وہ اِنسان پہلا قِصّہ گو تھا جس نے پہلی بار کسی دوسرے اِنسان کو اپنے اوپر گذرا ہوا کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے اس میں تھوڑا سا مبالغہ شامل کر دیا تھا۔ وہیں سے قِصّہ گوئی اور خود قِصّے نے جنم لیا۔ قِصّہ اس واقعے کو کہا جا سکتا ہے جسے ہم ذرا مبالغے سے بیان کریں۔ جس کی شدّت کو ہم موقع محل کی مناسبت سے الفاظ کی کمی بیشی سے بڑھا دیں ۔ فراعنۂ مصر کے دَور سے بہت پہلے دجلہ اور فرات کی وادی میں ہمیں ایسے قِصّہ گو ملتے ہیں جو کارواں سراؤں کی نیم روشن ڈیوڑھیوں میں بیٹھ کر سفر کرنے والوں یا سفر کی صعوبتوں سے تھکے ہوئے مسافروں کو کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ قافلہ ایک شہر سے دوسرے شہر کی جانب رواں ہے۔ راستے میں کسی نخلستان میں پڑاؤ کیا جاتا ہے۔ خیمے لگ جاتے ہیں ۔ عورتیں آگ جلا کر کھانا پکانے لگتی ہیں۔ رات کو صحرا کے نیلے آسمان پر چاند نکل آتا ہے۔ کھجوروں کے جھنڈ تلے قالین پر لوگ کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور قِصّہ گو اپنا ساز لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی کہانی سنانی شروع کر دیتا ہے

اس عہد کی کہانیاں عام طور پر منظوم ہوتی تھیں اور قِصّہ گو بیچ بیچ میں لَے گا کر سناتا تھا۔ موقع محل کے مطابق وہ اپنی کہانی میں ساز کی آواز بھی شامل کر دیتا تھا۔ یونانی مورّخ ہیروڈوٹس نے حمورابی بادشاہ کے دَور کے ایک ایسے قِصّہ گو کا ذکر کیا ہے جو کہانی اس مؤثر انداز میں سناتا تھا کہ لوگوں پر جادو سا کر دیا کرتا تھا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ اس داستان گو نے ایک بار آدھی رات کے وقت کہانی سناتے سناتے صحرا کی گرم دوپہر کا نقشہ اتنی قادر الکلامی سے کھینچا کہ اکثر لوگوں کو کہانی سنتے سنتے شدید گرمی کا احساس ہوا اور وہ چشمے کی طرف جانے کے لئے اٹھ دوڑے۔

ول ڈیورانٹ نے اپنی کتاب "سٹوری آف سولائزیشن" کی جلد اول OUR oriental heri tage ) میں لکھا ہے کہ قِصّہ گوئی کی ابتدا دنیا کے ہر خطّے سے ہوئی لیکن اسے حسین ترین لباس مشرق نے پہنایا۔ مشرق پُراسرار ہے اور یہی پُراسراریت اور سحرکاری مشرق نے قِصّہ گوئی کے فن کو عطا کی۔ داستان کا سفر قدیم ہے۔ قِصّہ گوئی ایپس کی وادیوں اور گال کے قبیلوں میں سفر کرتی جب وادی فرات میں پہنچی تو اسے خلعت شاہانہ پہنا کر مسندِ شاہی پر بٹھایا گیا۔ مشرقی دیومالاؤں نے داستانوں میں جنم لیا۔ اِسم اعظم۔ لوحِ نقشِ سلیمانی۔ شاہ جنات ۔ کوہ قاف کی پریاں۔ جنگلوں میں اچانک مدد کو پہنچنے والے درویش اور انسانوں کے سروں والے جانور اور جانوروں کے سر والے انسان ـــــ یہ ساری روایت ہمیں مشرق سے ملتی ہے۔

دجلہ اور فرات کی وادی سے قِصّہ گوئی کی روایت فراعنۂ مصر کے عہد میں آئی اور اس میں کاہن اعظم اور ہیکل اعظم کا تصوّر اُبھرا۔ تاریخی اعتبار سے یہ دَور جادوگری اور سحرکاری کے عروج کا دَور تھا۔ اب داستان میں جادوگروں کے ذرا سے اسم پھونکنے پر بڑے بڑے محل تنکوں کی مانند ہوا میں اڑنے لگے اور پہاڑوں کی دیواریں شق ہو کر وہاں سے چشمے اُبلنے لگے۔ اب تک یہ ساری داستانیں سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں۔ فرعونوں کے دَور میں پیشہ ور قِصّہ گوؤں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ امرا بڑی بڑی ضیافتوں میں ان پیشہ ور داستان گوؤں کو بلوا کر اُن کی کہانیوں سے اپنے مہمانوں کا دل بہلاتے۔ انہیں بڑے انعام و اکرام سے نوازتے اور ان کی ہمّت افزائی کی جاتی تھی۔ جس قِصّہ گو کی داستان میں زیادہ ہوش رُبا طلسمی واقعات ہوتے وہ زیادہ مقبول ہوتا۔ اس کی مانگ زیادہ ہوتی تھی۔ چنانچہ داستان گو

ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے خیال سے بڑھ چڑھ کر جادو کے من گھڑت واقعات اپنی کہانیوں میں شامل کرتے۔

اس مقصد کے لئے وہ بڑے بڑے جادوگروں کی خدمات بھی حاصل کرتے اور اُن سے سحرکاری کے نئے نئے انداز معلوم کر کے ان کے مطابق اپنے کردار وضع کرتے۔ اگر ایک داستان گو نے اڑن کھٹولا اپنی داستان میں ایجاد کیا تو دوسرے نے ایک ایسے محل کا ذکر کیا جسے جادو کے زور سے اٹھا کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچایا جا سکتا تھا۔ شاہی سرپرستی نے فرعون کے دَور میں قصہ گوئی کے فن کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا۔ مشہور ملکہ مصر نفریتی کے پاس ایک ایسا قصہ گو ہر وقت موجود رہتا تھا جو وقت اور موسم سے بے نیاز ہر وقت اور ہر موسم میں اُسے اپنی کہانی سنا کر خواب کی دنیا میں پہنچا سکتا تھا۔ ملکہ ہر رات اس قصہ گو سے کہانی سُنے بغیر سو نہ سکتی تھی۔ پلوٹارک نے ایک ایسے داستان گو کا ذکر کیا ہے جس نے مصر کے کسی صوبے کے گورنر کی بیٹی کی بیماری کا علاج داستان سنا کر کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس لڑکی کو ایک ایسی بیماری لگ گئی تھی کہ اُسے نیند نہ آتی تھی اور ہر وقت اُسے اپنے آنکھوں کے سامنے جانوروں کے سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔ داستان گو نے اُسے ہر روز کہانی سنانی شروع کر دی۔ تین دن کے بعد لڑکی گہری نیند سو گئی اور جب سو کر اٹھی تو بالکل صحیح ذہنی حالت میں تھی۔

آہستہ آہستہ ان داستان گوؤں کو شاہی محل میں اتنا اثر و رسوخ حاصل ہو گیا کہ انہوں نے شاہی دربار کی سیاست میں دخل دینا شروع کر دیا۔ لیکن بے چارے داستان گو سیاست کی فریب کاریوں سے ناآشنا تھے۔ چنانچہ شاطر درباری سیاستدان انہیں ہلاک کر کے بڑی آسانی سے اپنے راستے سے ہٹا دیتے۔ اس قدرتی عمل سے فن قصہ گوئی کو یوں نقصان پہنچا کہ اُسے شاہی سرپرستی حاصل نہ رہی۔ داستان گو دربار سے نکل کر ایک بار پھر کارواں سراؤں کی نیم تاریک ڈیوڑھیوں اور دریائے نیل کے کنارے آن بیٹھے۔ لیکن اب ان کی وہ قدر نہ ہوتی تھی۔ انہیں شاہی دربار میں رہ کر بیش قیمت انعام و اکرام کی عادت پڑ چکی تھی۔ دربار سے الگ ہو کر وہ اس سے محروم ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ساتھ ہی ساتھ طبابت بھی شروع کر دی اور قصہ گوئی کے ساتھ ساتھ بیماریوں کا علاج بھی کرنے لگے۔ کچھ نے جادوگری سیکھنا شروع کر دی۔ چنانچہ فراعنہ مصر کے عہد میں کوئی پانچ سو برس تک اس فن کو زوال رہا۔ اور آخری دَور میں قصہ گوئی کے ساتھ ساتھ طبابت کا نام بھی منتھی ہو کر رہ گیا تھا۔ اب مصر کے قصہ گو زیادہ تر طبیب اور چھوٹے موٹے روحانی معالج بن گئے تھے جو جڑی بوٹیوں کے علاوہ جادو ٹونوں اور تعویذ گنڈوں سے بیماروں کا علاج بھی کرتے تھے۔

## دیومالائی داستان

ہر علاقے کی دیومالا اس علاقے کی قصہ گوئی میں شامل ہو چکی تھی۔ کالی بلّی کو فراعنہ مصر سے پہلے کے قصہ گو بھی نحوست کے طور پر استعمال کرتے تھے اور اس کا ذکر اس وقت کرتے جب کسی بادشاہ کا زوال بتلانا مقصود ہو یا کسی شہزادی کی کایا کلپ کے لئے کوئی جادوگر اسم تیار کر رہا ہو۔ جادوگر سامری کے کاندھے پر ہر وقت ایک کالی بلّی سوار رہتی تھی جس کی زرد آنکھوں میں بلا کی کشش اور سحر تھا۔ حمورابی کے دَور کے قصہ گوؤں کی دیومالا ان دیوتاؤں کے گرد گھومتی تھی جنہوں نے دریاؤں کی گہرائیوں میں جنم لیا تھا اور جن کی روحیں پرانے سنگِ اسود کے مقبروں میں رہتی تھیں۔ سانپ کا تصور واضح طور پر فراعنہ مصر کے شروع میں قصہ گوؤں کے ہاں پہنچا۔ تاریخ نویسوں نے قدیم مصر کے دَور کو اس قدر تزک و احتشام سے پیش کیا ہے کہ اس سے قبل کی تاریخ اس کے آگے ماند پڑ کر رہ گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فراعنہ مصر سے پہلے کی انسانی تہذیب نے آج کے انسان کو بہت کچھ دیا۔ حمورابی کے اخلاقی منشور کو کسی دَور کی بھی انسانیت فراموش نہیں کر سکتی۔

اسی طرح سے مصر سے پہلے کے قصہ گو اپنی شوخ کلام بلاغت اور اثر آفرینی کے باعث نقطۂ عروج تک پہنچے ہوئے تھے۔ اگر ہم یوں کہیں کہ وہ لوگ بلاشبہ آج کی داستان کی بنیاد رکھ رہے تھے اور یونانی دیومالا کے تار و پود ترتیب دے رہے تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ یونان کی دیومالا ہمیں فراعنہ مصر سے پہلے کے اُر اور فرات کی وادی کی دیومالا کی اولاد معلوم ہوتی ہے۔ جو سحر حمورابی کے جادوگروں نے تحریر کیا، اسی کا اِسمِ اعظم مصر کے کاہنوں نے دشمنوں پر پھونکا اور ستاروں کی جو تقویم حمورابی کے دَور کے منجمین نے مرتب کی اسی کی روشنی میں مصر کے کاہنوں اور ہیکل اعظم کے ستارہ شناسوں نے اس علم کو آگے بڑھایا۔

نقش سلیمانی کی علامت مصریوں نے بنی اسرائیل سے حاصل کی اور بنی اسرائیل نے اسے اپنے عہد کے پیغمبروں سے بھی پہلے کے دیومالائی قصہ گوؤں سے سنا تھا۔ سانپ کا بھٹکانا۔ بلّی کی نحوست۔ سو سال بعد سانپ کا جُون بدل لینا۔ دیوتاؤں کا انسانوں کے روپ میں دنیا میں آنا۔ آسمانی بلاؤں کا خوبصورت شہزادیوں کی شکل میں زمین پر اتر کر نیک دل شہزادوں کو ورغلانا اور کوہ ندا کے جن کی صدا ـــــ یہ دیومالائی کردار اتنے پرانے ہیں کہ ان کی قدامت پر ہمیں یقین نہیں آتا۔ یونانیوں نے پہلی بار ان دیومالائی قصوں کو تحریری شکل دی۔ اس سے پہلے صرف مصر کے چند ایک درباری داستان گوؤں کی کہانیوں کو پختہ تختیوں اور کاغذ پر ضبط تحریر میں لایا گیا تھا۔ لیکن شاہی دربار میں قصہ گوؤں کے زوال اور شاہی سرپرستی سے محرومی کے بعد کہانیوں کی یہ تحریری دستاویزیں قعرِ گمنامی میں جا گریں۔ ایچ۔ ایم ولیم اپنی کتاب "اولڈ ہسٹری آف اولڈ سٹوری ٹیلرز" میں لکھتا ہے کہ ان لکھی ہوئی خوبصورت اور محیرّ العقول جادوئی کہانیوں کو شاہی حکیموں کی نگرانی میں تلف کر دیا گیا۔ اس کی سب بڑی وجہ یہ تھی کہ شاہی قصہ گو چونکہ اپنی کہانیوں اور بعض تعویذ گنڈوں سے مختلف بیماریوں کا علاج بھی کرنے لگے تھے اور یوں وہ شاہی حکیموں اور طبیبوں کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گئے تھے۔ چنانچہ جب قصہ گوؤں کا زوال شروع ہوا اور وہ شاہی عتاب میں آ گئے تو ان شاہی طبیبوں کو موقع ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ قصہ گوؤں کی مخبری کر کے ان کو چن چن کر قتل کروایا اور انہیں ملک بدر کروایا بلکہ ان کی کہانیوں کو بھی شاہی خزانوں سے نکلوا کر اپنے سامنے جلوا دیا۔

## نیل کے داستان گو

مصریوں نے کہانی سنانے والوں کو زمین پر سے اٹھا کر دیوتاؤں کے ساتھ آسمانوں پر بٹھا دیا۔ فرعونوں نے انہیں شاہی مسند کے ساتھ کرسی عطا کی اور دربار میں اُن کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ قصہ گو فرعونوں کے دربار میں اگر کسی سے دبتے تھے تو وہ کاہن اعظم کی شخصیت تھی۔ اس لئے کہ کاہن اس وقت کا جادوگر بھی تھا اور دربار کی سب سے خطرناک سیاسی شخصیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب قصہ گو اپنی حد سے آگے بڑھے اور انہوں نے کاہن کے سر پہ پیر رکھ کر آگے نکلنے کی کوشش کی تو وہ منہ کے بل گرے اور ایسی پٹخنی کھائی کہ پھر نہ اٹھ سکے۔ یہ مصری کاہن کی جادوگری یا سحرکاری نہیں تھی بلکہ اس کی سیاسی بصیرت اور جوڑ توڑ کی پالیسی تھی جس پر عمل کر کے اس نے قصہ گوؤں کو ہمیشہ کے لئے شاہی دربار سے نکال باہر کیا اور پھر ایک خاص مدت تک مصر میں کسی طرف سے بھی قصہ گو کی آواز سنائی نہ دی۔ داستان سنانے والوں کے لئے مصر کی سرزمین تنگ ہو گئی تھی۔ وہ اس زمین سے باہر نکل گئے۔ یہاں سے نکل کر وہ بابل و نینوا کی پُراسرار وادی میں جا کر آباد ہو گئے۔ برس ہا برس تک وہ گمنامی اور خاموشی کی زندگی بسر کرتے رہے اس لئے کہ بابل و نینوا میں کہانیاں سنانے والوں کو شاہی دربار میں کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ بس یہ قصہ گو پرانی کارواں سراؤں میں جا کر تھکے ہارے مسافروں کو قصے سنا کر اپنی روزی کما لیتے۔ بابل و نینوا کی سلطنتیں اس وقت اپنی تاریخ کے انتہائی پُرشورش اور بحرانی دور میں سے گزر رہی

تھیں۔ قصہ گوئی کی عیاشی کا انہیں ہوش نہیں تھا اور شاہی سرپرستی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ہمارے یہ داستان گو بے تاج شہزادے گمنامی کے اندھیروں میں زندگی بسر کرنے لگے۔ پھر جب وہ فرعون مرگیا جس نے مصری داستان گوؤں کو قتل کیا تھا اور جلاوطن بھی کیا تھا تو ایک رات جب کہ گہرے نیلے آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور ستاروں کا عکس دریائے نیل کے پُرسکون پانی میں جھلملا رہا تھا تو کنارے پر مہندی کی جھاڑیوں اور کھجور کے درختوں کے جھنڈوں میں سے ایک آواز بلند ہوئی۔

"ــــ قسم ہے آسمانی دیوتاؤں کی اور قسم ہے ستاروں کی جو آدھی رات کو بھی صحرا میں راستہ دکھاتے ہیں کہ کہانی بیان کرنے والا اس قصّے کو بیان کرنے سے پہلے ایک بادشاہ کا ذکر کرتا ہے کہ جس کی ملکہ کا ماتھا چاند کی طرح چمکتا تھا اور جس کے سیاہ بالوں پر کالے انگور کے خوشوں کا گمان ہوتا تھا۔ یہ بادشاہ ایک رات اپنی ملکہ کے پہلو میں سویا ہوا تھا کہ آسمان پر سے شاہی دیوتا کا رتھ گذرا۔ دیوتا کی نظر ملکہ کے خوبصورت سنہری جسم پر پڑی تو وہ رک گیا اور جھک کر ملکہ کے عریاں جسم کو دیکھنے لگا جو کہکشاں کی مانند چمک رہا تھا اور جس کی بند آنکھوں پر سوئے ہوئے کنول کے پھول کا گمان ہوتا تھا اور جس کی کمر چیتے کی کمر سے بھی پتلی تھی اور جس کی گردن پر سیاہ بال دریائے نیل کے دلدلی سانپوں کی طرح لپٹے ہوئے تھے اور جس کے ہونٹوں پر سُرخ یاقوت دمک رہے تھے......"

یہ آواز اس داستان گو کی تھی جس نے دریائے نیل کی چاندنی رات میں سالہا سال کے بعد پہلی بار آواز بلند کی تھی۔ اس پُراسرار رومانی آواز میں اتنی کشش تھی کہ لوگ اپنے اپنے خیموں سے نکل کر اس کی جانب کھنچتے چلے گئے۔ جو اس داستان گو کے قریب پہنچے وہ اسکی داستان سننے میں اس قدر محو ہوئے کہ انہیں کچھ بھی ہوش نہ رہا۔ ماہی گیر اپنی کشتیاں کنارے پر لگا داستان گو کے اردگرد آکر بیٹھ گئے۔

دریائے نیل کا کنارہ داستان گوؤں کی جنت کہلانے لگا۔ ہر روز رات کو یہاں جگہ جگہ مجمع لگتا جہاں داستان گو کھڑے ہو کر، بیٹھ کر اور چل پھر کر لوگوں کو قصّے کہانیاں سناتے۔ آدھی آدھی رات تک لوگ دم بخود وہاں بیٹھے کہانیاں سنتے رہتے اور پھر ان داستان سنانے والوں کو اپنی اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ نذرانہ دے کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے۔ جو داستان گو سب سے زیادہ دلچسپ کہانی سناتا اس کے پاس لوگ زیادہ جمع ہوتے۔ ہر پورے چاند کی رات کو یہاں میلہ لگتا۔ اس میلے میں دوسرے شہروں سے بھی قصہ گو آتے اور اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ ان میلوں کا حال ہمیں تاریخ کی پرانی کتابوں میں ملتا ہے۔ پلوٹارک نے پرانے مصری فراعنہ کے بارے میں لکھتے ہوئے ایک بادشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اُسے عام لوگوں میں بیٹھ کر قصّہ کہانی سننے کا اتنا شوق تھا کہ وہ بھیس بدل کر محل سے نکل کر دریائے نیل کے کنارے پہنچ جاتا اور داستان گو کے فن کے مظاہرے سے لطف اندوز ہوتا۔ ایک بار وہ پہچان لیا گیا اور اس کے دشمن اس پر حملہ آور ہوئے لیکن وہ بچ کر محل میں آگیا۔ اس کے بعد اس فرعون نے نیل کے کنارے داستان گوؤں کے میلے کو ممنوع قرار دے دیا۔ یہ اس کا ذاتی انتقام تھا جو اس نے اپنے دشمنوں سے لیا۔ داستان گوئی دریائے نیل سے ہجرت کر گئی۔

## ایک سحر طراز داستان گو

امرائے مصر نے اب اپنے اپنے گھروں میں قِصّہ گوئی کی محفلیں بپا کرنی شروع کر دیں۔ امراء کی سرپرستی میں یہ فن ایک بار پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کارواں سراؤں، قہوہ خانوں اور صحراؤں کے نخلستانوں میں داستان گو باقاعدہ اپنی زبان کا جادو پھیلاتے رہے۔ شاہی محل میں البتہ قِصّہ گوؤں کا داخلہ بدستور بند رہا۔ اس لئے کہ بادشاہ کو شک تھا کہ جن لوگوں نے اس پر حملہ کیا تھا ان میں ایک داستان گو بھی شامل تھا۔ بعد میں اس داستان گو کو دوسرے ملزموں کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ وقت گذرتا چلا گیا۔ فرعون نے داستان گوؤں کا دارالسلطنت میں داخلہ بند کر دیا تھا۔ لیکن جیسے کہ ول ڈیورانٹ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ظالم بادشاہوں کے ساتھ ایک اچھی بات یہ بھی منسلک ہوتی ہے کہ وہ مرجاتے ہیں۔ چنانچہ یہ فرعون بھی مرگیا۔ اس کی موت کے بعد ایک نوعمر فرعون تخت پر بیٹھا جس کی بڑی بہن اسکی سرپرست تھی۔ اس شہزادی کا نام مورخوں نے نہیں لکھا۔ نہ اس فرعون کا کوئی نام تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔ اس شہزادی کو ایک ایسا مرض لاحق ہو گیا کہ اسے رات کو قِصّہ سنے بغیر نیند نہ آتی تھی۔ نئے فرعون کے حکم سے فوراً ایک داستان گو کا انتظام کیا گیا۔ داستان گو نے آکر شہزادی کے شاہی پلنگ کے کنارے پردے میں بیٹھ کر داستان شروع کی۔ بدقسمتی سے اس شخص کی آواز بھدی تھی۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ہی اسے محل سے نکال دیا گیا۔ اس زمانے میں الکا نام کے ایک داستان گو کا بڑا شہرہ تھا۔ لوگوں نے اس کے بارے میں مشہور کر رکھا تھا کہ وہ جانوروں کو بھی اپنی کہانی سنا کر سلا دیتا ہے۔ فرعون نے الکا کو شاہی محل میں بلوانے کا حکم دے دیا۔ الکا ایک نوجوان خوش شکل انسان تھا۔

وہ شہزادی سے چھ سات برس چھوٹا تھا۔ شہزادی اسے دیکھتے ہی اُس پر عاشق ہو گئی۔ الکا بھی شہزادی کے تیرِ نظر کا شکار ہو چکا تھا۔ اس نے شہزادی کے پلنگ کے قریب پردے میں بیٹھ کر اپنی سحر انگیز داستان کا آغاز کیا۔ یہ کہانی پرانے دیوی دیوتاؤں کی محبت کی داستان تھی۔ مصیبت یہ ہو گئی کہ محض الکا کی موجودگی کی وجہ سے شہزادی کو نیند نہ آتی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے محبوب کے دیدار سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ چنانچہ دونوں نے ایک دوسرے پر اپنے دل کا حال ظاہر کر دیا۔ اظہار محبت ہو گیا تو الکا داستان گو نے کہا۔

"شہزادی! میری کہانی آپ کو کبھی سونے نہیں دے گی۔ بہتر یہی ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں اور آپ کسی دوسرے داستان گو کو بلائیں۔ تاکہ وہ آپ کو سلا سکے"۔

شہزادی نے کہا۔

"الکا! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تمہاری محبت میں بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر تمہاری جدائی گوارا نہیں کر سکتی۔"

نوعمر فرعون کا وزیر ایک خطرناک سازشی آدمی تھا۔ مصر کے کاہنوں میں اس کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ وہ فرعون کو قتل کر کے شہزادی سے شادی کرنے کے بعد تخت پر قبضہ کرنے کی سازش کر رہا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ شہزادی داستان گو الکا کے دام محبت میں گرفتار ہو چکی ہے تو وہ ایک دم چوکس ہو گیا۔ یہ اس کی راہ میں اب سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اس نے داستان گو کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

رات کو سونے سے پہلے ایک خادمہ داستان گو الکا کے لئے مشروب کا گلاس لے کر جایا کرتی تھی۔ اس نے خادمہ کو اپنے اعتماد میں لے کر اس مشروب میں بڑا مہلک زہر ملا دیا۔

خادمہ خاموشی سے زہر ملا مشروب لے کر داستان گو کے ایوان میں داخل ہوئی۔ وہ الکا بلک رہا تھا۔ خادمہ گلاس اس کے چاندی کے میز پر رکھ کر دبے پاؤں واپس آگئی۔ داستان گو کی بلی میز کے پاؤں کے پاس بیٹھی بار بار میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ الکا نے ایک بار بلی کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ بھوکی ہے۔ چنانچہ اس نے گلاس میں سے تھوڑا سا مشروب لے کر بلی کے آگے ڈال دیا۔ بلی طشتری میں پڑے مشروب پر لپکی اور اُسے پینے لگی۔ ابھی اُس نے چھ سات گھونٹ ہی پیئے ہوں گے کہ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ اوندھے منہ گری

اور پھر اکڑ کر مرگئی۔ داستان گو الکا نے چونک کر بلی کی طرف دیکھا وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے گلاس کے مشروب کو سنبھال کر ایک بوتل میں بند کر دیا اور چپکے سے نکل کر سیدھا شہزادی کے کمرے میں پہنچا۔ شہزادی نے الکا کو دیکھا تو پوچھا کہ خیریت تو ہے۔ داستان گو الکا نے بتایا کہ اُسے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور پھر اس نے شہزادی کو بلی کا سارا واقعہ بیان کر دیا۔ شہزادی سمجھ گئی کہ یہ ساری سازش وزیر کی ہے۔

شہزادی نے الکا سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ دونوں مصر کا شاہی محل چھوڑ کر جنوبی افریقہ کی طرف نکل جائیں گے۔ الکا بھی راضی ہوگیا۔ وہ چپکے سے اپنے محل میں جاکر سو گیا۔ صبح جب وزیر نے اُسے زندہ چلتے پھرتے دیکھا تو بڑا پریشان ہوا اور اس نے خادمہ کو بلا کر پوچھا کہ اس نے زہر والا مشروب کسے دیا تھا؟ خادمہ نے قسم کھا کر کہا کہ وہ اس کے میز پہ گلاس رکھ کر واپس آگئی تھی۔ بہر حال وزیر سمجھ گیا کہ داستان گو الکا کو زہر کے بارے میں علم ہوگیا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اُسے قتل کروا دیا جائے۔ اُس نے ایک آدمی کو خنجر دے کر داستان گو کی خواب گاہ کی طرف روانہ کیا۔ اس وقت شہزادی اور داستان گو محل سے فرار ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ قاتل واپس مڑنے ہی والا تھا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ گر پڑا۔ آواز سن کر الکا اس کی طرف متوجہ ہوا۔ قاتل خنجر سمیت پکڑا گیا۔ اس نے اعتراف بھی کر لیا کہ اُسے وزیر نے داستان گو کو قتل کرنے کے واسطے بھیجا تھا۔ شہزادی نے اس سے کہا کہ وہ اب زندہ واپس نہیں جا سکتا۔ یہ کہہ کر شہزادی نے اپنے خنجر کو بے نیام کیا۔ اور قاتل کے سینے میں بھونک دیا۔ داستان گو الکا شہزادی کو خون کرتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے وہم میں بھی یہ بات نہ تھی کہ شہزادی جس سے وہ محبت کرتا ہے ایک جیتے جاگتے انسان کو ہلاک کر سکتی ہے۔ لیکن وہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

وہ آدھی رات کی تاریکی میں شاہی محل کے عقبی دروازے سے نکل کر قلعے کے باغ میں آگئے۔ باغ میں گھنے درختوں نے گہرا اندھیرا کر رکھا تھا۔ یہاں ایک خادمہ ان کے لئے دو سیاہ گھوڑے لئے تیار کھڑی تھی۔ الکا اور شہزادی گھوڑوں پر سوار ہوگئے۔ اور قلعے کی فصیل کے پیچھے آگئے۔ یہاں ان کا ایک خاص آدمی دروازہ کھولے انتظار کر رہا تھا۔ دونوں محبت کرنیوالے اس راستے سے نکل کر گھوڑے دوڑاتے رات کے اندھیرے میں غائب ہوگئے۔ صبح ہوتے ہی محل میں شہزادی اور داستان گو الکا کے فرار کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ فرعون کو اپنی بہن کی اس گھٹیا حرکت پر بے حد صدمہ ہوا۔ وزیر نے بہت بڑھا چڑھا کر کہانی سنائی اور خوب لگائی بجھائی کی۔ کاہنوں نے بھی آگے بڑھ کر اپنے فیصلے کا اعلان کیا کہ شہزادی نے ایک معمولی قصہ گو کے ساتھ فرار ہو کر شاہی خاندان کی عزت کو اور شاہی خانوادے کے ناموس کو مٹی میں ملا دیا ہے۔ لہٰذا قانون کے مطابق ان دونوں کو موت کی سزا دی جائے۔

نوعمر فرعون مجبور ہوگیا کہ دونوں کی سزائے موت پہ مہر تصدیق ثبت کر دے۔ اسی وقت برق رفتار گھوڑ سواروں کو مفروروں کی تلاش میں روانہ کر دیا گیا۔ اس زمانے میں راستے غیر ہموار اور دشوار گذار ہوتے تھے۔ شہزادی اور داستان گو الکا اس کے باوجود راتوں رات مصر کی سرحدیں عبور کر کے سوڈان کے جنوبی گھنے جنگلوں میں پہنچ چکے تھے۔ لیکن شاہی سوار برابر ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ شہزادی کو بھی معلوم تھا کہ شاہی سپاہی ان کی تلاش میں ضرور پیچھے آئیں گے۔ چنانچہ ایک دریا کے کنارے رک کر اس نے داستان گو الکا سے کہا۔

"پیارے الکا! شاہی فوج ہمارے تعاقب میں آرہی ہوگی میرا خیال ہے کہ ہمیں دریا عبور کر کے کسی محفوظ جگہ چھپ کر انتظار کرنا چاہیئے کہ شاہی فوج کے سپاہی یہاں سے گذر جائیں۔ تاکہ ہم تسلی کے ساتھ اپنا سفر جاری کر سکیں۔"

داستان گو نے کہا۔

"جیسی تمہاری مرضی شہزادی!"

حقیقت یہ تھی کہ الکا نے جب سے شہزادی کو ایک انسان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتے دیکھا تھا وہ اس سے دل برداشتہ ہوگیا تھا۔ اب اس کے دل میں شہزادی کی محبت نہیں رہی تھی۔ پھر بھی وہ مرد ہونے کے ناطے سے شہزادی کے اعتماد کو ٹھیس لگا کر اسے جنگل بیابان میں اکیلی چھوڑ کر چلے جانا بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اب شہزادی کا پورا پورا ساتھ نبھانا چاہتا تھا۔ دریا عبور کرنے کے لئے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ داستان گو نے ایک درخت کے بڑے سے تنے کو کاٹ کر اسے رسیوں سے باندھا اور اس پہ سوار ہو کر انہوں نے گھوڑوں سمیت دریا عبور کر لیا۔ لکڑی کے لٹھے کو انہوں نے دریا میں بہا دیا تاکہ کسی دوسرے کے کام نہ آسکے۔ دریا پار کرنے کے بعد انہوں نے اپنے سامنے ایک جنگل دیکھا۔ یہ جنگل پہلے جنگل سے زیادہ گھنا تھا۔ اس میں سے گھوڑوں کا گذرنا محال ہو رہا تھا۔ شہزادی نے گھوڑوں کو دریا برد کر دینے کا مشورہ دیا جسے داستان گو نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ گھوڑوں کے بغیر وہ زندہ نہ رہ سکیں گے۔ شہزادی خاموش رہی۔

جنگل کے کافی دور اندر جاکر انہیں چٹان کے سائے میں ایک کھنڈر سا دکھائی دیا۔ داستان گو شہزادی کو لے کر اس پرانے کھنڈر میں داخل ہوگیا۔ اس کھنڈر میں کسی دیوی کا بہت بڑا بُت بنا تھا جو جگہ جگہ سے شکستہ ہو رہا تھا۔ داستان گو چونکہ دیومالائی روایات سے واقف تھا اس لئے وہ سمجھ گیا کہ یہ افریقہ کی ایک ایسی قدیم قوم کی دیوی کا بت ہے جو کہ اب اس علاقے سے ہجرت کر چکی ہے۔ سفر کرتے کرتے وہ تھک گئے تھے۔ انہوں نے یہاں کچھ دیر آرام کیا۔ شہزادی نے ایک تالاب پر غسل کیا۔ پھر داستان گو درختوں پر سے پھل توڑ کر لایا۔ دونوں نے پھل کھائے اور سو گئے۔ اصل میں داستان گو الکا جاگ رہا تھا۔ شہزادی اسکے پہلو میں لیٹی گہری نیند سو رہی تھی۔ داستان گو سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں سے کہاں آگیا ہے؟ وہ تو ایک رومانوی داستان گو ہے۔ وہ کس مصیبت میں پھنس گیا۔ اُسے شاہی محلوں کی سازشوں اور عشق و محبت سے کیا سروکار؟ شاہی بادشاہ زادی سے عشق اُسے بہت مہنگا پڑے گا۔ کاش وہ کسی ماہی گیر کی بیٹی سے محبت کرتا کہ جس کی یاد میں وہ نئی نئی کہانیاں سناتا۔ اور پھر اس کے ساتھ شادی کر کے خوشی خوشی زندگی بسر کرتا۔

لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ویسے بھی اسکی مردانگی یہ ہرگز گوارا نہیں کرتی تھی کہ ایک ایسی عورت کو جنگل میں تنہا چھوڑ دے جو محض اس کی محبت کے سہارے شاہی عزت و آبرو کو چھوڑ کر شاہی محل سے نکل آئی ہے۔ رات بڑی خاموش تھی۔ آسمان پر نیلے نیلے ستارے چمک رہے تھے۔ کھنڈر کی چھت نہیں تھی۔ جنگل کی طرف سے کبھی کبھی کسی اُلو کے بولنے کی آواز آجاتی تھی۔ اتنے میں اچانک داستان گو نے کچھ ایسی آوازیں سُنیں جیسے پرندے بے تاب ہو کر پر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ وہ چوکنا ہو کر ہمہ تن گوش ہوگیا۔ اچانک اسے ایک گھوڑے کے دُور سے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گیا کہ شاہی فوج کے سپاہی اُن کی تلاش میں وہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ اُس نے جلدی سے شہزادی کو جگا دیا۔ شہزادی اٹھ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ الکا نے اسے بتایا کہ دشمن سر پر پہنچ گیا ہے۔ اب یہاں سے فرار ہو جانا چاہیئے شہزادی نے کہا۔

"ہم ان کا مقابلہ کریں گے!"

داستان گو الکا نے کہا "ہم دو انسان اتنے سپاہیوں کا کہاں تک مقابلہ کریں گے یہ عقل مندی کے خلاف ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم یہاں سے بھاگ چلیں!"

شہزادی بہادر عورت تھی وہ وہاں رُک کر مقابلہ کرنا چاہتی تھی مگر اپنے شاعر مزاج

داستان گو محبوب کے آگے بے بس ہوگئی۔ وہ بادلِ نخواستہ اٹھی۔ کمر کے ساتھ تلوار باندھی اور گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ داستان گو الکا بھی گھوڑے پر سوار ہو گیا اور وہ رات کے اندھیرے میں خاموشی سے کھنڈر سے باہر نکل گئے۔ کھنڈر کے عقب میں ایک گھنا جنگل تھا جہاں چھوٹے چھوٹے اونچے نیچے بے شمار ٹیلے تھے جن پر قد آدم گھنی جھاڑیوں کے جھنڈ اگے ہوئے تھے۔ شہزادی نے داستان گو سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں کسی جگہ چھپ کر یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ہمارے پیچھے آنے والے سپاہیوں کی تعداد کتنی ہے اگر وہ تھوڑے ہوئے تو ہم انہیں باری باری چالاکی سے قتل کر دیں گے۔ کیونکہ آخر ہم کہاں تک اُن سے آگے آگے بھاگتے چلے جائیں گے۔"

داستان گو نے کہا۔

"شہزادی! اگر سپاہی تھوڑے ہوئے تو ٹھیک ہے ہم انہیں مکاری سے کام لے کر ہلاک کر دیں گے۔ لیکن اگر اُن کی تعداد زیادہ نکل آئی تو ہم کیا کریں گے؟ پھر اُن سے بچ کر کہاں جاسکیں گے۔ وہ تو ہمارے سر پہ پہنچ چکے ہوں گے۔"

شہزادی نے کہا۔

"الکا! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اسقدر ڈرپوک ہو گے۔ میں عورت ہو کر دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہتی ہوں اور تم مرد ہو کر بھاگ رہے ہو۔"

الکا نے کہا۔ "شہزادی! یہ بزدلی کی بات نہیں ہے۔ بلکہ محض عقلِ سلیم کی بات ہے۔ یہاں بہادری دکھانا اپنے آپ کو ہلاک کرنیکے مترادف ہے۔ اس لئے میری صلاح اب بھی یہی ہے کہ یہاں سے جتنی جلدی ہوسکے ہمیں بھاگ نکلنا چاہیئے۔"

وہ ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ دشمن کے سپاہی اُن کے بالکل قریب آن پہنچے۔ انہیں گھوڑوں کے ہنہنانے اور سپاہیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ رات اندھیری تھی۔ جنگل میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شہزادی اور داستان گو کو ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ کہیں اُن کے گھوڑے بھی دوسرے گھوڑوں کو ہنہناتا دیکھ کر ہنہنانا نہ شروع کر دیں۔ کیونکہ اس طرح سے اُن کی بڑی آسانی سے نشاندہی ہو جائے گی اور وہ پکڑے جائیں گے۔ اب شہزادی کو بھی ملال سا ہونے لگا کہ اس نے اپنے محبوب کے مشورے پر عمل نہ کر کے بڑی غلطی کی ہے۔ کیونکہ سپاہیوں کی تعداد زیادہ تھی۔

دونوں محبت کرنے والے جھاڑیوں کے عقب میں چھُپ گئے۔ انہوں نے احتیاطاً گھوڑوں کے جبڑے چادروں سے باندھ دیئے تاکہ وہ ہنہنا نہ سکیں۔ سپاہی اب ان کے قریب سے گذر رہے تھے اور آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مفرور عاشقوں کی تلاش کرتے کرتے تھک گئے ہیں اور اب کسی جگہ آرام کرنا چاہتے ہیں۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ اچانک جنگل میں ایک درخت پر کوئی پرندہ زور سے بولا۔ اس کی آواز پر شہزادی کا ایک گھوڑا بڑے زور سے ہنہنایا۔ اس کے ہنہنانے کی آواز تو دب گئی مگر اس نے غصے میں آکر زور زور سے زمین پر پاؤں مارے۔ زمین سخت تھی۔ اُس کے پاؤں مارنے کی کرخت آواز جنگل کے سناٹے میں گونج اُٹھی۔

سپاہی چلتے چلتے ایک دم رُک گئے۔ انہوں نے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز بڑی واضح طور پر سُنی تھی۔ شہزادی نے داستان گو اور داستان گو نے اندھیرے میں شہزادی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ سپاہی اس طرف آئے جدھر یہ دونوں جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ گھوڑے کھڑے تھے۔ سپاہیوں کی گھوڑیاں گھوڑوں کی بُو پاکر زور سے ہنہنائیں۔ ان کی بُو پاکر شہزادی کا گھوڑا بھی زور زور سے زمین پر ٹاپیں مارنے لگا بس پھر کیا تھا۔ سپاہیوں نے جھاڑیوں کو گھیرے میں لے لیا۔ سردار نے تلوار نکال کر کہا۔

"شہزادی صاحبہ! جھاڑیوں سے باہر نکل آئیں۔ داستان گو الکا! تم بھی باہر آجاؤ۔ ہمیں فرعون کی طرف سے حکم ملا ہے کہ ہم تم دونوں کے سر اتار کر اپنے ساتھ لے جائیں لیکن ہم تم پر رحم کریں گے۔ تمہیں اتنی اجازت دیں گے کہ تم رات کا باقی حصہ ہماری قید میں آرام کر سکو۔ تمہارا یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ تم دونوں ہمارے گھیرے میں آچکے ہو اگر تم نے فرار ہونے کی کوشش کی تو تمہیں پلک جھپکنے میں میرے سپاہی ہلاک کر دیں گے۔"

شہزادی نے الکا کا ہاتھ دبا کر کہا۔

"موت ہمارے سر پہ منڈلا رہی ہے۔ ہم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے لیکن ہم بھاگنے کی کوشش کریں گے۔"

داستان گو نے بھی موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑے دیکھا۔ لیکن وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سرگوشی میں شہزادی سے کہا۔

"ایسا نہیں ہوگا شہزادی! بھاگنے کی صورت میں ہم موت سے نہیں بچ سکیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہم ان سے نجات حاصل کر لیں گے۔"

شہزادی نے پوچھا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ لوگ ہمیں زنجیروں میں جکڑ دیں گے۔ پھر ہم ان سے کیسے چھٹکارا حاصل کر سکیں گے؟"

داستان گو بولا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں نے اپنے اُستاد سے ایک جادو سیکھ رکھا ہے۔ وہ جادو ہمیں ان کی قید سے نجات حاصل کرنے میں مدد دے گا۔"

شہزادی نے کہا۔

"کیا تم اس وقت وہ جادو ان پر نہیں پھونک سکتے؟"

"نہیں! ہمارا گرفتار ہونا ضروری ہے۔"

ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ سپاہی اُن کے سروں پہ پہنچ گئے۔ انہیں سردار کے حکم سے فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ دونوں محبت کرنے والوں کے ہاتھ پاؤں چاندی کی زنجیروں سے باندھ دیئے گئے۔ سپاہیوں نے اُسی جگہ رات بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تعاقب کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہیں نیند بھی آرہی تھی۔ آخر سردار کے مشورے پر آرام کرنے اور باقی رات جنگل میں گذارنے کا فیصلہ کیا گیا۔

الاؤ روشن کر دیا گیا۔ شہزادی اور الکا کو ایک جگہ بٹھلا کر زنجیر درخت کے ساتھ باندھ دی گئی۔ چار سپاہی ان کے قریب ہی پہرہ دینے لگے۔ سردار بھی آرام کرنے کی غرض سے دوسرے سپاہیوں کے ساتھ لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ خراٹے بھرنے لگے۔ داستان گو الکا اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے جادو کو آزمانے کے لئے زبان کھولی۔ اس نے پہریدار سپاہیوں کو مخاطب کر کے ایک داستان کا آغاز کر دیا۔ پہریداروں نے اسے کہانی سنانے سے منع کرنا چاہا مگر اس کی کہانی سنانے کا انداز اور کہانی کا آغاز اسقدر دلچسپ اور سحر انگیز تھا کہ سپاہی کچھ نہ بول سکے اور ہمہ تن گوش ہو کر الکا کی کہانی سننے لگے۔ کہانی سناتے سناتے الکا کو خود اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ پہلے وہ ذرا بلند آواز سے بول رہا تھا۔ پھر اسکی آواز سرگوشیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایسے لگ رہا تھا جیسے سانپ آہستہ آہستہ پھنکار رہے ہوں۔ یہ ایک ایسا جادو، ایک ایسا سحر تھا کہ پہریدار اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور ان پر غنودگی سی طاری ہونا شروع ہوگئی۔ ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ شہزادی پر بھی نیند کی حالت طاری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ لیکن الکا داستان گو کہانی سناتے سناتے بار بار شہزادی کے ہاتھ کو زور سے دبا دیتا تھا جس سے شہزادی فوراً

ہوش میں آجاتی تھی۔ آخر پہریداروں پر گہری نیند طاری ہوگئی۔ وہ بے سُدھ ہو کر پڑے تھے۔

## داستان گو کا فرار

الکا اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے شہزادی کو اشارہ کیا کہ زنجیروں کو کھولنے کی کوشش کرے۔ زنجیریں بڑی سختی سے باندھی گئی تھیں۔ پھر بھی الکا نے زور لگا کر اپنے ہاتھوں کو ان کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ خود آزاد ہو کر اس نے شہزادی کی زنجیریں بھی کھول دیں۔ اب وہ آزاد تھے۔ وہ خاموشی سے دبے پاؤں اُٹھے اور پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتے وہاں سے نکل گئے۔ ذرا پرے اُن کے دونوں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑے آرام سے گھوڑوں کو کھولا۔ ان پر سوار ہوئے اور انہیں گھاس پر قدم قدم چلاتے فرار ہوگئے۔ وہ جنوب مشرق کی طرف سفر کرنے لگے۔ رات گذرتی چلی جا رہی تھی۔ صبح کی سپیدی نمودار ہوئی تو وہ دونوں جنگل سے نکل کر ایک چھوٹے سے دریا کے کنارے پہنچ گئے تھے۔ دریا کا پاٹ اگرچہ چھوٹا تھا مگر اس کی رفتار بڑی تیز تھی۔ سوائے گھوڑوں پر سوار ہو کر دریا پار کرنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔

انہوں نے گھوڑوں کو دریا میں ڈال دیا۔ پانی کے تیز ریلے نے گھوڑوں کو ایک طرف دھکیل دیا۔ لیکن طاقت ور گھوڑوں نے دریا کی تہہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ دریا پار کر گئے اب ان کے سامنے ایک سلسلہ ہائے کوہ کھڑا تھا۔ اونچے اونچے پہاڑ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو ہو کر آگے بڑھتے چلے گئے تھے۔ وہ کسی جگہ رُک نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے گھوڑوں کو آگے بڑھا دیا۔ وہ گھوڑے دوڑاتے پہاڑی گھاٹیوں میں سے گذرتے چلے گئے۔ دوپہر تک وہ وادیوں اور گھاٹیوں میں سفر کرتے رہے۔ جب دھوپ کی حدّت ناقابلِ برداشت ہوگئی تو وہ ایک چشمے کے کنارے رک گئے۔ یہاں انہوں نے گھوڑوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ تھیلے میں سے خشک روٹی اور پھل نکال کر کھائے۔ پانی پیا اور اپنے مستقبل کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔

شہزادی نے کہا۔

"ہم مصر کی سرحد سے کافی آگے نکل آئے ہیں۔ یہاں سے بادشاہ طلاقس کی حکومت شروع ہوتی ہے۔ اُس کے ساتھ میری ماں کے بڑے گہرے مراسم رہے ہیں۔ اگر ہم کسی طرح اس کے محل تک پہنچ جائیں تو پھر فرعون کے سپاہی ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔"

داستان گو نے کہا۔

"شہزادی! میں تمہاری محبت کے پیمان میں بندھا تمہارے ساتھ ہوں۔ تم اگر مجھے موت کی وادی میں بھی لے جاؤ گی تو وہاں جانے سے انکار نہیں کروں گا۔ لیکن اگر شاہ طلاقس نے ہمیں پکڑ کر فرعون کے سپاہیوں کے حوالے کر دیا تو کیا ہوگا کیونکہ مجھے اتنا تو معلوم ہے کہ شاہ طلاقس کے فرعون کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات ہیں۔"

شہزادی نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ شاہ طلاقس کے فرعون سے اچھے تعلقات ہیں۔ لیکن میں اپنی والدہ کے مراسم سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گی۔ دوسرے یہ طلاقس کبھی مجھ پر بھی عاشق رہا ہے۔ اس نے میرے ساتھ شادی کرنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا۔"

الکا نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو پھر وہ مجھے ہرگز ہرگز زندہ نہ چھوڑے گا۔"

شہزادی نے کہا۔ "اگر اس نے تمہاری جان لینے کی کوشش کی تو میں اس کے سینے میں اپنا خنجر گھونپ کر خود بھی جان دے دوں گی۔"

بہر حال داستان گو الکا سمجھ گیا تھا کہ اب اُس کی خیر نہیں ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ شہزادی کی محبت بھری باتوں میں نہ آتا اور آج دریائے نیل کے کنارے پھر کے ماہی گیروں اور غریب تاجروں اور مزدوروں کو اپنی کہانیاں سنا سنا کر ان سے داد وصول کر رہا ہوتا۔ لیکن اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وقت گذر گیا تھا۔ اور گذرا ہوا وقت پھر کبھی واپس نہیں آیا کرتا۔ داستان گو کو اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے پیمانِ عشق کو آخری دم تک نبھانا چاہتا تھا۔ اس نے آخری دم تک شہزادی کا ساتھ دینے کا پختہ ارادہ کر رکھا تھا۔ موسم سخت گرم ہو گیا تھا۔ وہ سارا دن اسی جگہ آرام کرتے اور باتیں کرتے رہے۔

شام کو جب دھوپ ڈھل گئی اور تپش کم ہوئی تو وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اپنے سفر پر ایک بار پھر روانہ ہوگئے۔ ساری رات اُن کا سفر جاری رہا۔ صبح کی روشنی پھیلی تو انہیں دور پہاڑیوں کے درمیان ایک بستی کے مکان نظر آئے۔ ان مکانوں میں ایک شاہی محل بھی تھا جس کے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ شہزادی نے مسکرا کر داستان گو الکا کی طرف دیکھا اور کہا۔

"الکا! ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ سامنے جو محل تم دیکھ رہے ہو یہ شاہ طلاقس کا محل ہے۔ اب فرعون کی فوجیں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔"

داستان گو الکا نے غور سے محل کے چمکتے کلسوں کو دیکھا اور دل میں سوچنے لگا کہ دیوتا ہی جانیں کہ وہاں کسی قسم کی مصیبتیں اُس کا انتظار کر رہی ہیں۔ کیونکہ محبت جب ایک بادشاہی محل میں داخل ہو جاتی ہے تو پھر خاک و خون میں تڑپے بغیر نہیں رہتی۔ وہ سفر کرتے کرتے شاہ طلاقس کے شہر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہاں پہریداروں نے انہیں روک دیا۔ شہزادی نے اپنی شاہی انگوٹھی کی مہر دکھاتے ہوئے انہیں کہا کہ میں فرعون مصر کی بہن ہوں اور شاہ سے ملنے آئی ہوں۔ جا کر اُسے خبر کرو۔ پہریدار گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگے انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ شہزادی اور الکا شاہی محل کی طرف روانہ ہوگئے۔ سپاہی ان کے ساتھ ساتھ تھے۔

شاہی محل میں جب شاہ طلاقس کو خبر ملی کہ اس کی دیرینہ محبوبہ خود اس کے محل کی طرف آ رہی ہے تو خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ سنہری رتھ پر سوار ہو کر خود محل سے باہر نکلا اور شہزادی کے استقبال کو آگے بڑھا۔ محل سے تھوڑی ہی دُور اس نے شہزادی کا خیر مقدم کیا۔ شہزادی گھوڑے سے اُتری تو شاہ طلاقس نے اسے اپنے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ اس وقت ہمارے غریب فنکار داستان گو الکا کے سینے پر ضرور سانپ لوٹ گیا ہوگا۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ سب سے زیادہ افسوس اسے اس بات کا ہوا کہ شہزادی نے شاہ طلاقس سے اس کا تعارف ایک غلام کی حیثیت سے کرایا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ وہ شاہی محل میں داخل ہوگئے۔ طلاقس شہزادی کو اپنے ساتھ شاہی آرام گاہ میں لے گیا۔ داستان گو الکا کو مہمان سرائے میں بھجوا دیا گیا۔ رات کو شہزادی کے اعزاز میں بڑی زبردست دعوت ہوئی۔ الکا بھی اس دعوت میں شریک ہوا۔ وہ شہزادی کا شاہانہ لباس دیکھ کر حیران رہ گیا۔

طلاقس تخت پر اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اسی شاہی ضیافت میں درباریوں کے مبارک سلامت کے شور میں اس نے اعلان کر دیا کہ وہ شہزادی سے شادی کر رہا ہے۔ اس خبر نے الکا کے دل پر گہرا اثر کیا۔ وہ شہزادی کا منہ ہی تکتا رہ گیا۔ شہزادی درباریوں اور شاہ طلاقس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ یہی مقصد لے کر شاہی محل سے فرار ہوئی تھی۔ اُس نے ایک بار بھی داستان گو الکا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ الکا دل مسوس کر رہ گیا۔ اُسے شہزادی کے ہرجائی پنے پر بے حد غصّہ آیا اپنے آپ پر بھی اسے بہت غصّہ آیا کہ اس نے خواہ مخواہ ایک

ہرجائی عورت کے پیچھے لگ کر اپنی زندگی اور فن کو خطرے میں ڈالا۔ وہ اسی وقت ضیافت سے اٹھ کر اپنے شاہی مہمان خانے میں آگیا۔ وہ پلنگ پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے وہ واپس مصر نہیں جاسکتا تھا جہاں اس کے ماں باپ رہتے تھے۔ اب اسے پہلی بار اپنی ماں اور بہنوں کا خیال آیا جو اس سے حقیقی محبت کرتی تھیں۔ جن کی محبت لازوال تھی اور دنیا کے ہر لالچ سے بے نیاز تھی۔

آدھی رات تک وہ پلنگ پر اسی طرح لیٹا رہا۔ اُسکی آنکھوں میں اپنی ماں اور بہنوں کو یاد کر کے بار بار آنسو آجاتے تھے۔ اس کے پاس ہی شمع جل رہی تھی۔ سامنے بالکونی کے اوپر جنوبی افریقہ کا سیاہ آسمان ستاروں کو لئے چمک رہا تھا۔ شاہی محل کی جانب سے ضیافت میں شریک مہمانوں کے قہقہوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اچانک الکا نے ایک خوشبو محسوس کی۔ اس سے پہلے اسکی خواب گاہ میں ایسی خوشبو نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس کے سامنے شہزادی زرق برق شاہی لباس میں کھڑی تھی اس کا چہرہ چاند کیطرح چمک رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ الکا کو اس کی مسکراہٹ بڑی پُرفریب محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی گلہ کرتا، شہزادی نے جھک کر کہا۔

"الکا گھبرا کیوں گئے۔ میں تم سے اور صرف تم سے پیار کرتی ہوں۔ یہ سب کچھ میں نے اس لئے کیا ہے کہ ہم اپنی زندگی محفوظ کر سکیں۔"

داستان گو نے کہا۔

"لیکن شہزادی! تم تو شاہ طلاقس سے شادی کر رہی ہو۔ پھر تم میرے ساتھ زندگی کیونکر بسر کر سکو گی؟"

شہزادی نے الکا کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے الکا! میں اگر شاہ طلاقس سے شادی کر بھی لوں گی تو محبت تم ہی سے کرتی رہوں گی۔"

داستان گو کی غیرت نے یہ جملہ گوارا نہ کیا۔ اس نے زور سے شہزادی کا ہاتھ جھٹک کر پرے کر دیا۔ شہزادی کو اس کے ہاتھ کا جھٹکے جانا بہت بُرا لگا۔ اُس نے غصے میں آکر کہا۔

"تم نے میرا ہاتھ جھٹکنے کی جرأت کیوں کر کی؟ آخر تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟ تم ایک معمولی داستان گو ہو۔ یہ میری محبت تھی جس نے تمہیں گلیوں کی گندی نالیوں سے اٹھا کر شاہی محل میں پہنچا دیا۔ میں تمہاری محبت پر اپنا وقار اور شاہی حسب و نسب کبھی قربان نہیں کر سکتی۔"

یہ کہہ کر شہزادی غصے میں ہی خواب گاہ سے باہر نکل گئی۔ اب داستان گو الکا کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اُسے محسوس ہو گیا تھا کہ اس نے ایک شاہی عورت کی محبت کا جواب محبت میں دے کر اور پھر اس کے ساتھ فرار ہو کر زندگی کی سب سے بڑی بھول کی ہے۔ وہ اپنے کئے پر بے حد پچھتا رہا تھا۔ وہ شہزادی سے اس کی بے وفائی کا کوئی بدلہ نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ اب وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ اس نے اٹھ کر اپنا ضروری سامان ایک اونی تھیلے میں رکھا اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

اُدھر شہزادی کو الکا کے سر میں ہاتھ پھیرتے اور اس سے چھپ کر باتیں کرتے شاہ طلاقس کے خاص جاسوس نے دیکھ لیا تھا۔ یہ جاسوس شاہی محل میں شہزادی کے ساتھ ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ اس نے جا کر شاہ طلاقس کو ساری خبر سنا دی۔ شاہ طلاقس کا چہرہ جوشِ رقابت سے اور سیاہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ شہزادی غلام کی شکل میں اپنے عاشق کو ساتھ لے کر اس کے محل میں داخل ہوئی ہے۔ وہ ضرور اس کے ساتھ دھوکہ کر رہی ہے۔ وہ ہرجائی ہے۔ بے وفا ہے۔ اُسے اُلو بنا کر اپنا اُلو سیدھا کر رہی ہے۔ شاہ طلاقس نے اسی رات اپنے جلاد کو حکم دیا کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے شہزادی کا سر کاٹ کر شاہی محل کے بڑے دروازے پر لٹکا دیا جائے اور الکا داستان گو کو گرفتار کر کے بندی خانے میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شہزادی بے خیالی میں اپنی شاہی خواب گاہ میں اطلس و کمخواب کے بستر پر دراز تھی۔ آدھی رات گذر چکی تھی۔ شاہ طلاقس ابھی ابھی اس کے بستر سے اٹھ کر گیا تھا۔ وہ خواب کی رنگین دنیا میں کھوئی ہوئی تھی کہ خواب گاہ کا دروازہ کھلا اور ایک سیاہ حبشی ننگی تلوار لئے اندر داخل ہوا۔ شہزادی اس کیطرف حیرانی سے تکنے لگی۔

"تمہیں بلا اجازت میری خواب گاہ میں داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی ـــــ"

جلاد نے سر جھکا کر کہا۔

"شہزادی صاحبہ! میں اپنے بادشاہ کے حکم سے آپ کی گردن کاٹنے آیا ہوں۔"

اب تو شہزادی کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ اس کی شاہی محلوں میں پرورش ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جب اس قسم کے حالات میں کوئی جلاد شاہی خواب گاہ میں داخل ہوتا ہے۔ تو وہ غلط بات نہیں کہتا۔ اس نے اپنی زندگی میں اس طرح کئی لوگوں کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر بستر پر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت اسے اپنے غریب محبوب الکا کا خیال آیا۔ اگر وہ وہاں ہوتا تو ضرور اس کی مدد کرتا۔ مگر وہ اکیلی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ شاہ طلاقس اس کی گردن اڑانے کا حکم دے چکا ہے۔ پھر بھی اس نے اپنے اوسان خطا نہ کئے اور حبشی جلاد کے پاؤں پر گر پڑی۔ اس سے رحم کی بھیک مانگی۔ اس پر اپنے حُسن کا جال پھینکا جوانی کی جھلک دکھائی۔ مگر شاہی جلاد اندھا، بہرا اور گونگا ثابت ہوا۔ اس نے کوئی بات نہ کی اور آگے بڑھ کر شہزادی کے سر کے بالوں کو پکڑ کر اوپر کر لیا اور دوسرے ہاتھ سے تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ مار کر اس کی نازک گردن اڑا دی۔

شہزادی کی گردن نازک تھی۔ ایک سیکنڈ کے اندر اندر اس کا سر جلاد کے ہاتھ میں آگیا۔ خواب گاہ میں شہزادی کا خون ہر طرف بکھر گیا۔ جلاد گردن لے کر شاہ کے پاس چلا گیا۔ اُدھر داستان گو الکا شہزادی کی بے وفائی پر آنسو بہا رہا تھا کہ سپاہی اندر داخل ہوئے اور اُسے گرفتار کر کے لے گئے۔ وہ ان سے پوچھتا ہی رہ گیا کہ اُس کا جرم کیا ہے سپاہی کچھ نہ بولے۔ داستان گو بندی خانے میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔ صبح ہوئی تو الکا کو یہ اندوہناک خبر سنائی گئی کہ شہزادی کو قتل کر کے اس کا سر شاہی محل کے دروازے پہ لٹکا دیا گیا ہے۔ وہ ششدر ہو کر رہ گیا۔ اس کے لئے وہ شہر اب ایک دشمن بادشاہ کا شہر تھا۔ اسے اس شہر اور وہاں کے لوگوں سے اب کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ خود اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ اس کی زندگی کا انجام کیا ہوگا؟ کیا اسے شاہ طلاقس معاف کر دیگا؟ ہرگز نہیں۔ اُسے بھی قتل کر کے اُسکی گردن شاہی محل کے دوسرے دروازے پر لٹکا دی جائے گی۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ اگر اسے قتل ہی کیا جانا تھا تو پھر یہ تاخیر کس لئے؟ اُسے اتنی مہلت کیوں دی گئی ہے؟

وہ یہی سوچتا رہا اور صبح ہو گئی۔ بندی خانے کا دروازہ کھُلا اور ایک سپاہی اندر آیا۔ اس نے الکا کو بتایا کہ آج رات اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ شہنشاہ طلاقس کے حکم سے شاہ محل کے عقب میں ایک الاؤ روشن کیا جائے گا۔ جب آگ خوب بھڑک اُٹھے گی تو بادشاہ اپنے ہاتھوں سے اپنے رقیب کو آگ میں دھکیلے گا۔ اب داستان گو کی سمجھ میں آیا کہ اس کے ساتھ تاخیر کی رعایت کیوں برتی گئی ہے۔ بادشاہ خود اسے ہلاک کرنا چاہتا تھا وہ غم زدہ ہو گیا۔ اپنے گھر والوں کو یاد کر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اب ساری کہانی ختم ہو چکی تھی۔ موت اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ لیکن وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ شہزادی کی موت کے بعد اس کے دل میں زندہ رہنے کی خواہش

پہلے سے دس گنا زیادہ طاقت ور ہو گئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ ہرگز موت قبول نہیں کرے گا وہ قبل از وقت کی موت قبول نہیں کرے گا۔ وہ زندہ رہے گا۔ ہر حالت اور ہر قیمت پر زندہ رہے گا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ اس بھیانک جیل خانے سے کس طرح اپنی جان بچا کر بھاگ سکے گا۔ لیکن ایک آواز اس کے اندر سے آ رہی تھی جو اسے کہہ رہی تھی کہ وہ مرے گا نہیں۔ وہ زندہ رہے گا۔ ہر حالت اور ہر قیمت پر زندہ رہے گا۔

دن گذر گیا۔ شام کے سائے محل کے اوپر منڈلانے لگے۔ جیل کی سلاخوں میں سے اُس نے کچھ سپاہیوں کو آپس میں اس کی طرف دیکھ کر باتیں کرتے اور ہنستے مسکراتے دیکھا۔ داستان گو الکا کا ذہن اس سے پہلے کبھی اتنی تیزی سے حرکت میں نہیں آیا تھا۔ اس نے فرار کی تجویزوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ مگر ہر بار وہ یہی سوچتا کہ وہاں سے کیسے فرار ممکن ہے؟ شام کے سائے رات کے اندھیروں میں مدغم ہونا شروع ہو گئے۔ داستان گو الکا کی طبیعت بے چین ہونے لگی کیونکہ اس کے ذہن میں ابھی تک فرار ہونے کا کوئی واضح منصوبہ نہیں آیا تھا۔ سپاہیوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ انہوں نے داستان گو کو زندہ آگ میں جلانے کے لئے محل کے عقبی میدان میں آگ کا بڑا الاؤ روشن کر دیا ہے۔ الکا گھبرا گیا۔ موت اس کے قریب سے قریب تر آ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگا۔ مگر اس کا دل بار بار اسے کہہ رہا تھا کہ وہ مرے گا نہیں۔ وہ مرے گا نہیں۔

### داستان گو یونان میں

مصر کے اس سحر طراز داستان گو کی داستان بیان کرنے والا مورخ لکھتا ہے کہ ٹھیک اس وقت جب کہ داستان گو الکا موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا آسمان پر سیاہ بادل نمودار ہوئے اور بجلی بار بار چمکنے لگی۔ داستان گو نے ایک دم سے بلند آواز میں ایک پرانی کہانی بیان کرنی شروع کر دی۔ اس کی کہانی کا انداز ایسا جادو بھرا تھا کہ سپاہی بجلی کی چمک اور کڑک سے پناہ لینے کے لئے الکا کے پاس سلاخوں کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ مورخ لکھتا ہے کہ شاید داستان گوئی کی تاریخ اس وقت اپنے عروج پر تھی۔ کہتے ہیں کہ الکا کچھ ایسے پُر درد اور اثر انگیز انداز میں کہانی بیان کر رہا تھا کہ جس کسی کے کان میں بھی اس کی آواز پڑی وہ اس کی طرف کھنچا چلا آیا۔ سپاہی یہاں تک مسحور ہو گئے تھے کہ انہیں یہ بھی خبر نہ رہی تھی کہ وہ کہاں ہیں اور کس جگہ پر ہیں۔ شاید الکا اسی لمحے کے انتظار میں تھا۔ اس نے اپنی سحر بیانی کو اور مہمیز لگائی اس کی آواز میں ایک جادو کا اثر رچ گیا۔ اس کا لہجہ ایک دم سے سرگوشی میں بدل گیا۔ آسمان پر بجلی چمکنا بند ہو گئی۔ بادل چھٹنے لگے۔ جلادوں کا خیال تھا کہ شاید بارش کی وجہ سے پھانسی ملتوی کرنی پڑ جائے۔ لیکن آسمان ایک دم سے صاف ہو گیا تھا اور آگ اسی طرح بھڑکتی رہی۔ لیکن یہ سب کچھ شاید الکا کو جیل سے بھگانے کے لئے ہوا تھا۔ کیونکہ جب کہ محل کے عقب میں الکا کو زندہ جلانے کے لئے آگ بھڑکائی جا رہی تھی اور بادشاہ شاہ طلاقس نے آگ کے شعلوں کے قریب جب دیکھے جبوترے پر اپنا تخت سنبھال لیا تھا تو ادھر جیل خانے کے سارے پہرے دار داستان گو طلاقس کی کہانی سن سن کر بے ہوش ہو چکے تھے۔ یا گہری نیند میں کھو گئے تھے الکا نے ایک پہرے دار کی جیب سے سلاخوں کے اندر سے ہاتھ ڈال کر چابی نکالی اور کوٹھڑی کا تالہ کھول کر باہر نکل آیا۔ سارے سپاہی ایک ہی جگہ اس کی داستان سنتے سنتے گہری نیند میں کھو چکے تھے۔ الکا جیل سے باہر آ گیا۔ باہر کے بڑے دروازے والا پہرے دار جاگ رہا تھا اور دروازے کے سامنے چل پھر کر پہرہ دے رہا تھا۔ الکا ایک طرف ہٹ کر محل کی دیوار کے سائے میں آ گیا ایک جگہ اس نے زیتون کے درخت کو دیکھا جس کی ایک ڈال محل کی دیوار کے اوپر سے ہو کر باہر جھک رہی تھی۔ وہ تیزی سے درخت کے اوپر چڑھ گیا۔ پھر وہ اس ڈال پر آ گیا جو دیوار کے اوپر تھی۔ ڈال پر سے اس نے دیوار پر چھلانگ لگا دی اور وہاں سے دوسری جانب کھائی میں کود گیا۔ یہاں گھنی گھاس اور پانی تھا۔ اس کے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ لیکن اس کی جان بچ گئی تھی۔ وہ کھائی کے اندر ہی اندر سے ہوتا ہوا اس جگہ پر آ گیا جہاں ایک چھوٹا سا پل بنا تھا۔ وہ اس پل پر چڑھ گیا۔ یہاں سے ایک پکی سڑک شہر کے عقبی دروازے کی طرف چلی گئی تھی۔ اس نے سڑک پر آتے ہی بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔

وہ جتنی جلدی ہو سکے اس شہر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اسے معلوم تھا جب سپاہیوں کو پتا چلا کہ الکا غائب ہے تو وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اس کی تلاش میں چاروں طرف سے نکل کھڑے ہوں گے اور وہ ان کی نظر سے بچ نہ سکے گا۔ اس لئے کہ ابھی تک وہ ان کے شہر کے اندر تھا۔ جس راستے پر وہ بھاگتا چلا جا رہا تھا اس کی دونوں جانب ذرا سے فاصلے پر لوگوں کے کچے کچے مکان بنے تھے۔ اچانک داستان گو نے محل کی طرف شور کی آوازیں سنیں۔ اس نے رک کر پلٹ کر دیکھا۔ محل کی طرف اُسے ایک جگہ آگ کے الاؤ کی دھیمی دھیمی روشنی دکھائی دی۔ یہ آگ اسے زندہ جلانے کے لئے جلائی گئی تھی۔ بادشاہ کو پتا چل گیا تھا کہ وہ فرار ہو گیا ہے۔ محل کی دیوار پر نقارے بجنے لگے۔ شاید یہ کسی مفرور قاتل کے فرار کا اعلان تھا۔ اس کے ساتھ ہی الکا نے ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں محل کے بڑے دروازے کو کھلتے اور اس میں سے گھوڑوں کے ایک دستے کو باہر تیزی سے نکلتے دیکھا۔ سپاہی اس کی تلاش میں شاہی محل سے تلواریں لہراتے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اب وہاں رکنا اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف تھا۔ وہاں سے بھاگنا بھی بے کار تھا۔ کیونکہ سپاہیوں کا ایک دستہ اسی سڑک کی طرف آ رہا تھا۔ الکا نے ارد گرد دیکھا۔ ذرا فاصلے پر ایک گھنی جھاڑی اگی ہوئی تھی۔ الکا کو اور کچھ نہ سجھائی دیا۔ وہ اس جھاڑی میں کود گیا اور اس نے اس کے پتوں میں اپنے آپ کو چاروں طرف سے چھپا لیا۔

تھوڑی دیر بعد گھوڑ سوار برق رفتاری سے گھوڑے دوڑاتے گرد اڑاتے اس کے قریب سے گذر گئے۔ وہ جھاڑیوں میں دیر تک دبکا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ گھوڑ سوار رات کے اندھیرے میں بہت دور نکل گئے ہیں تو وہ جھاڑیوں میں سے باہر نکلا اور درختوں کے جھنڈوں میں بنے کچے مکانوں کی طرف چل پڑا۔ اُسے آتا دیکھ کر ایک کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ الکا رک گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ کیا کرے؟ وہاں سے وہ شہر کی دیوار کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہاں ہر جگہ اس کے فرار کی اطلاع پہنچ چکی ہو گی اور پہرے دار شہر کی فصیل کے سارے دروازوں پر چوکس ہو گئے ہوں گے۔ لامحالہ اُسے کسی نہ کسی کے گھر پناہ لینے کی ضرورت تھی۔ صبح ہونے والی تھی۔ اگر وہ باہر رہا تو بھی گرفتار ہو جانے کا زبردست خطرہ تھا۔ اور اگر کسی نے اسے پناہ نہ دی یا اگر پناہ دے کر اس کے بارے میں انعام کے لالچ میں مخبری کر دی تو پھر وہ کیا کرے گا؟ یہ سارے خطرے اور خدشے اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو مقدر کے حوالے کر دے اور کسی جگہ پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ درختوں کے پیچھے سے ہو کر ایک چھوٹی سی بستی کی طرف بڑھا۔ یہ بستی ایک منزلہ مکانوں پر مشتمل تھی۔ الکا ایک مکان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اس نے سوچا کہ دروازے پر دستک دے یا نہ دے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ اچانک کھل گیا۔ وہ پیچھے ہٹا مگر اندر سے نکلنے والی ایک لڑکی نے اسے دیکھ لیا اور زور سے پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

یہ لڑکی ملی جلی مصری اور افریقی زبان بول رہی تھی۔ الکا نے آگے بڑھ کر اسے جھک کر سلام کیا اور کہا۔

"میری اچھی بہن! میں ایک مصیبت کا مارا مسافر ہوں۔ اس بستی میں پردیسی ہوں۔

موت میرا تعاقب کر رہی ہے۔ مجھے پناہ کی ضرورت ہے۔ مجھے اجازت دو کہ میں تمہارے گھر میں آکر تمہیں اپنی دردناک کہانی بیان کر سکوں۔"

الکا کو گفتگو کرنے کا فن تو بہت خوب آتا تھا۔ اس نے دو چار جملوں سے ہی اس سیاہ چشم خوبصورت لڑکی پر اپنا اثر ڈال لیا۔ اُس لڑکی نے اُسے ہاتھ سے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ الکا اس کے ساتھ مکان میں داخل ہو گیا۔ اندر صحن کے بیچ میں ایک فوارہ چل رہا تھا۔ پیچھے برآمدہ تھا اور برآمدے کے اندر دو کمرے بنے تھے۔ وہ لڑکی الکا کو برآمدے میں بچھے ہوئے سبز رنگ کے قالین پر بٹھا کر خود اندر چلی گئی۔ الکا سوچنے لگا پتا نہیں اس لڑکی کے دل میں کیا ہے۔ اتنا اسے معلوم تھا کہ وہ سپاہیوں کے آگے مخبری کرنے نہیں گئی۔

تھوڑی دیر میں کمرے میں سے اس کی ماں اور باپ باہر نکل آئے۔ الکا نے خاص شاہی انداز میں جھک کر ان دونوں کو سلام کیا اور اس سے پہلے کہ دونوں بوڑھے اس سے کچھ پوچھتے الکا نے خالص داستان گوئی کے انداز میں اپنی داستان غم بیان کرنی شروع کر دی۔ اپنی کہانی اس نے بالکل سچ سچ بیان کر دی اور کچھ ایسے پُر درد لہجے میں اپنے ماں باپ اور پیچھے رہ جانے والے بہن بھائیوں کا حال بیان کیا کہ وہ دونوں میاں بیوی اور ان کی لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جب الکا نے اپنی داستانِ غم سنانی بند کی تو وہ دونوں اس کی زندگی کی سرگزشت سے بے حد متاثر ہو چکے تھے۔ وہ اُسے اسی وقت اندر کمرے میں لے گئے۔ انہوں نے الکا کے آگے زیتون کا پھل اور اونٹنی کا دودھ پیش کیا۔ جسے الکا نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔

دن چڑھ آیا۔ الکا نے اپنا حال بالکل سچ سچ بیان کر دیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ شاہی سپاہی اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہے ہیں اور کوئی دم میں شاید ان کے مکان پر بھی چھاپہ پڑ جائے بوڑھے افریقی نے کہا۔

"بیٹا! میں نے دیوتاؤں کے نام پر تم پر رحم کھا کر اپنے گھر میں پناہ دی ہے میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔ میرا بھی ایک بیٹا تھا جسے شاہی فوج چوری کے جھوٹے الزام میں پکڑ کر لے گئی تھی اور اس کی لاش میرے گھر پھینک گئی تھی۔ آج سے تم میرے بیٹے ہو۔ میں تمہاری زندگی کی حفاظت میں اپنی زندگی کی بازی بھی لگا دوں گا۔"

یہ الکا کی داستان گوئی کے فن کا کمال تھا کہ اس نے ایک نامحرم انسان کو اپنا اس قدر گرویدہ بنا لیا تھا کہ وہ اس کی خاطر جان دینے کو تیار ہو گیا تھا۔ لڑکی پانی لینے چشمے پر چلی گئی۔ اس کی ماں چولہے پر دودھ گرم کرنے لگی۔ بوڑھا الکا کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک صحن کا دروازہ کھلا اور اس کی بیٹی بھاگتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے بتایا کہ شاہی فوج کے سپاہی ان کے گھر کی طرف آ رہے ہیں۔ الکا کو فوراً چھپا دیا جائے۔ بوڑھے افریقی نے الکا کو اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور اسے ساتھ لے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ یہاں گھاس پھونس بھرا پڑا تھا۔ اس نے ایک جگہ سے گھاس پرے ہٹایا۔ نیچے ایک تختہ بچھا تھا۔ تختہ اوپر اٹھایا تو نیچے سیڑھیاں ایک تہ خانے میں جا رہی تھیں۔

"بیٹا! اس تہ خانے میں جا کر چھپ جاؤ۔ جلدی کرو!"

الکا تہ خانے میں اتر گیا۔ بوڑھے افریقی نے اوپر سے تختہ لگا دیا اور اس کے اوپر گھاس پھوس ڈال دیا۔ دروازہ بند کر کے وہ واپس مکان کے صحن میں آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ سپاہی اس کے مکان کے دروازے کو دھڑام سے کھول کر اندر آ گئے۔ انہوں نے الکا کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ یہ بوڑھا افریقی پہلے بھی شاہی فوج کے عتاب میں آ چکا تھا۔ اس سے کچھ زیادہ ہی پوچھ گچھ ہوتی رہی اس نے کہا کہ وہ کسی بھی غیر شخص کو نہیں جانتا۔

"یہاں کبھی کوئی غیر آدمی نہیں آیا۔ جب سے ہمارا بیٹا مرا ہے ہم کبھی نہ خود باہر گئے ہیں اور نہ کبھی کوئی باہر سے مہمان ہی ہمارے گھر آیا ہے۔ آپ کو اگر شک ہے تو میرا گھر حاضر ہے آپ اس کی تلاشی لے سکتے ہیں۔"

سپاہیوں نے تلاشی لینی شروع کر دی۔ انہوں نے کمروں کے سارے سامان کو اتھل پتھل کر دیا۔ وہ گھاس پھوس والے کمرے میں بھی گئے۔ انہوں نے تلواریں اور نیزے مار مار کر سارے گھاس کو چھلنی کر دیا۔ بوڑھا باہر کھڑا فکر مند نظروں سے سپاہیوں کو تکتا رہا۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر کسی نے گھاس پھوس ہٹا کر دیکھ لیا تو کہیں انہیں تہ خانے کا تختہ نظر نہ آ جائے اور اگر کوئی سپاہی گھاس کو بائیں طرف سے یا آگے سے ہٹاتے تو انہیں یقیناً تہ خانے کا تختہ مل جاتا اور پھر الکا کے ساتھ ساتھ سارے گھر والوں کا گرفتار ہو جانا یقینی تھا۔ اور موت بھی یقینی تھی۔ لیکن سپاہی گھاس کے گٹھوں میں نیزے ہی مارتے رہے۔ کسی نے اُنہیں ہٹانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ سپاہی بڑبڑاتے، گالیاں دیتے صحن میں پڑے مٹی کے برتن توڑتے باہر نکل گئے۔ بوڑھے نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مصیبت آ کر ٹل گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ مٹی کے پیالے میں ستو اور شکر قندی لے کر تہ خانے میں الکا کے پاس گیا۔ اس نے الکا کو ساری کہانی سنائی کہ کس طرح سپاہی تلاشی لینے آئے تھے اور ناکام ہو کر واپس چلے گئے ہیں۔ الکا نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اس کی جان بچائی۔ الکا پورا ایک ہفتہ اس تہ خانے میں رہا۔ شام کو وہ سیر کرنے باہر نکل آتا تھا۔ بوڑھے نے اسے اس لئے وہاں رکھا تھا کہ کچھ دنوں بعد اس بستی سے ایک قافلہ گذرنے والا تھا۔ یہ قافلہ ملک یونان کی طرف جا رہا تھا۔ الکا اس قافلے کے ساتھ یونان کے ملک کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ اس ملک کے اس زمانے کے شہر سارٹیکس میں اس کی ایک چچی رہتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ مصر سے اس کی ماں بہن اور باپ وغیرہ ہجرت کر کے سارٹیکس چلے گئے ہوں گے۔ یہ قافلہ مصر کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ ہو کر سائرینیکا کے علاقے سے نکل کر بحیرہ روم کی بندرگاہ سلامیز تک جا رہا تھا۔ اس اعتبار سے یہ ہمارے داستان گو الکا کے لئے بڑا موزوں تھا۔ مگر سب سے کٹھن مرحلہ وہ تھا جب کہ اس قافلے کے شہر سے نکلنے کے بعد تلاشی لی جانے والی تھی۔

اس تلاشی میں الکا کا بچ کر نکل جانا ایک کرامت ہو گی۔ یہ مشکل بھی تھا۔ اس لئے کہ شاہ طلاقس کی طرف سے الکا کے مفرور ہو جانے کے بعد شہر سے جانے والے ہر قافلے یا گروہ کی سخت تلاشی کا حکم صادر کر دیا گیا تھا۔ داستان گو الکا کو اس بستی کے پُر اسرار تہ خانے میں رہتے ہوئے دو ہفتے گذر گئے تو ایک دن بوڑھا خوشی خوشی اس کے پاس آیا اور اس نے اطلاع دی کہ قافلہ شہر کی کارواں سرائے میں پہنچ گیا ہے اور دو روز بعد یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ الکا بڑا خوش ہوا۔ اس نے تیاری شروع کر دی۔ بوڑھے نے اسے کچھ کپڑے لا کر دیئے۔ یہ لباس ایک گھوڑوں کے تاجر کا تھا۔ الکا نے اپنے چہرے پر نقلی داڑھی بھی سجائی۔ آخر وہ دن آ گیا جب الکا اس گھر سے جدا ہو گیا۔ اس نے بوڑھے اور اس کی بیٹی کا بے حد شکریہ ادا کیا اور شام کا اندھیرا پھیلتے ہی کارواں سرائے پہنچ گیا۔ یہاں بڑی رونق تھی۔ مسافر اپنی اپنی تیاریوں میں لگے تھے۔ قافلہ رات کے پچھلے پہر وہاں سے روانہ ہونے والا تھا۔ الکا نے قافلے کے سردار سے اپنا تعارف گھوڑوں کے تاجر کی حیثیت سے کرایا اور اسے بتایا کہ وہ مال لے کر یہاں آیا تھا اور اب فروخت کر کے واپس جا رہا ہے۔ لیکن اس کا دل مطمئن نہیں تھا۔

ساری رات اس نے جاگ کر آنکھوں میں کاٹ دی۔ آخر رات کا پچھلا پہر آیا۔ قافلہ روانگی کے لئے تیار ہو گیا۔ سردار نے حکم دیا۔ اور قافلہ بستی کی کارواں سرائے سے روانہ ہو گیا۔ الکا اس قافلے میں ایک اونٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کا اونٹ قافلے کے قلب میں تھا۔ قافلہ صبح ہونے

تک شہر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ یہاں بادشاہ کی فوج کے سپاہی تلاشی کے لئے تیار کھڑے تھے۔ انہوں نے قافلے میں شریک ایک ایک مسافر کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ الکا کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اگرچہ اس نے اپنا حلیہ بالکل ہی بدل رکھا تھا۔ پھر بھی اسے پہچانے جانے کا ڈر تھا۔ کیونکہ تلاشی لینے والوں میں خاص طور پر اس غلام کو مامور کر دیا گیا تھا جو الکا کے چہرے سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب یہ غلام اس کے قریب آیا تو اس نے غور سے الکا کو دیکھا۔ الکا نے بڑی بے نیازی کا ثبوت دیا اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ بہت ہی بے نیازی سے اور سے تلاشی کی باطل پرواہ نہیں ہے جب کہ اس کا دل اندر سے بُری طرح پریشان تھا۔ اسے ایک ایک پل ایک ایک ہزار برس کا محسوس ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ بخیر و خوبی گذر گیا اور ہمارا تاریخی داستان گو صاف بچ گیا۔

قافلہ شہر کے دروازے سے باہر نکل کر اپنی نئی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب الکا کے سر سے بہت بھاری بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے نیا جنم لیا ہو۔ ایک مہینہ یہ قافلہ سفر کرتا رہا۔ ایک ماہ اور کچھ دنوں کے بعد یہ لوگ مصر کی راجدھانی کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ الکا کا دل اداس ہو گیا۔ وہ اپنے وطن کی خوشبو اپنے سینے میں اُترتی محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنے ماں باپ اور بہن بھائی یاد آ رہے تھے۔ اس نے دیوتاؤں کے حضور دعا کی کہ ان کے گھر بار والے خیر و عافیت سے یونان کی سلطنت میں پہنچ گئے ہوں۔ قافلہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک مقام پر مصر کے سپاہی آگئے۔ انہوں نے قافلے کی تلاشی لینے کی کوشش کی مگر قافلے کے سردار نے ان سپاہیوں کو رشوت دے کر پیچھا چھڑایا۔ ہمارے رومانوی داستان گو کا قافلہ تیسرے مہینے کی آخری تاریخوں کو جب کہ بحیرہ روم کے آسمانوں پہ نیلے ستارے چمک رہے تھے سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ یہاں سے اس کا سمندری سفر شروع ہوا۔ یہ سفر ایک بادبانی جہاز پہ طے ہوا۔ آخر وہ سائرکیس کی بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ یہاں سے وہ سیدھا اپنی چچی کے ہاں گیا اور اُسے معلوم ہوا کہ اس کے گھر بار والے سارے کے سارے اس کے اندازے کے مطابق مصر سے ہجرت کر کے یونان پہنچ چکے تھے۔

(کتاب مصری داستان گو۔ ہنری ول کوکسن۔ دوسرا حصہ آکسفورڈ پریس)

## داستان کا سفر ــــ یونان

قصہ گوئی مصری روایت الکا ایسے نامور اور اپنے عہد کے جادوگر داستان گوؤں کے حوالے اور وساطت سے یونان پہنچی۔ مصری حکومت کو زوال آیا تو دجلہ اور فرات کی وادی کے جنوب میں یونان کی سرزمین میں ایک نیا سورج طلوع ہوا۔ یہ وہ سورج تھا جس کی روشنی نے تاریخ کے بعض اوراق کو رہتی دنیا تک کے لئے روشن کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں میں بٹی ہوئی یہ سرزمین علم اور قانون اور ادب و فلسفہ کے مُبادیات کے لئے راہیں ہموار کرنے کے لئے آگے بڑھی۔ ان فنون کے ساتھ ساتھ ڈراما اور داستان گوئی نے بھی یہاں ترقی کرنی شروع کی۔ یونانی ڈرامے پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ آج ہمیں اسکے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن جیسا کہ ہنری ول کوکسن کا خیال ہے یونان کے فن قصہ گوئی کے بارے میں بہت ہی تھوڑی تحقیق ہوئی ہے۔ ول کوکسن انیسویں صدی کے اخیر میں آکسفورڈ کی ایک درسگاہ میں جغرافیہ اور تاریخ کا استاد تھا۔ تاریخ پڑھاتے پڑھاتے ایک روز (جیسا کہ اس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے) اس نے ایک ایسے یونانی قصہ گو کے بارے میں پڑھا جو اپنی داستان گوئی میں بنی اسرائیل کے قدیم داستان گوؤں کی ساری روایت کا حامل تھا۔ اور جس کے آباؤ اجداد ملکہ سلوی کے تاریخی اور شاہی قافلے کے ساتھ جیوڈیا کی راجدھانی میں آئے تھے۔ داستان گوئی کا فن اس کے خون میں رچا ہوا تھا۔ ہنری صاحب نے تاریخ کو چھوڑا اور قدیم داستانوں پر تحقیق شروع کر دی آکسفورڈ کی ایک ادبی اور تحقیقی انجمن نے ان کی مالی امداد کی اور وہ لندن سے ایک بحری جہاز میں سوار ہو کر سرزمین بنی اسرائیل میں آگئے۔ یہاں وہ پانچ برس تک پرانی داستانوں اور پرانے داستان گوؤں پر تحقیق کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ یونان آگئے۔ یہاں ایک لائبریری میں انہوں نے سات برس گذارے اور اسی یونانی داستان گو کے بارے میں تحقیق کی جس کے بارے میں پڑھ کر وہ آکسفورڈ سے چلے تھے۔ اس یونانی داستان گو کا نام ہنری ول کوکسن نے اپنی کتاب میں فیوبلس لکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ نام پچھلے دو ہزار برس کی تاریخ میں ایسا ہی چلا آ رہا ہے

## فیوبلس کی قصہ گوئی

ہنری صاحب نے فیوبلس پر بہت ریسرچ کی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ فیوبلس کے آباؤ اجداد چونکہ سرزمین بنی اسرائیل کے رہنے والے تھے اس لئے اس کے خون میں بنی اسرائیل کے قدیم قصوں کی روایات بھی رچی ہوئی تھیں۔ اسے بے شمار قدیم کہانیاں یاد تھیں۔ ان میں وہ کہانیاں بھی شامل تھیں جنہیں مصری داستان گو الکا دریائے نیل کے کنارے لوگوں کو سنا کر مسحور کیا کرتا تھا۔ فیوبلس بھی یونان کا ایک جادوگر داستان گو تھا۔ اس کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ حقیقت کے ساتھ ساتھ دیو مالا کو بھی کہانی میں شریک کرتا۔ ہنری صاحب کے خیال میں یونان کے ڈرامے کے بعض دیو مالائی کردار فیوبلس کی داستانوں سے ہوتے ہوئے وہاں تک پہنچے تھے۔ ہنری نے فیوبلس کی بعض کہانیاں بھی اپنی کتاب میں درج کی ہیں جن کے بارے میں ہنری صاحب کا دعوے ہے کہ یہ وہی کہانیاں ہیں جنہیں فیوبلس بحیرہ روم کے کنارے چاندنی راتوں میں لوگوں کو سنا کر مسحور کیا کرتا تھا اور جنہیں انہوں نے اپنی دس برس کی تحقیق کے بعد جمع کیا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ان کہانیوں میں ہمیں جن بھوت اور پریاں بہت کم ملتی ہیں۔ ان کے بجائے ہم قدم قدم پر دیوتاؤں کو حکم چلاتے اور زمین پر اتر کر شہزادیوں کو اغوا کرتے، اپنے رقیبوں کو قتل کرتے اور بعض جگہوں پر حسین عورتوں پر دست درازی کرتے ہوئے بھی دیکھتے ہیں۔

بابل و نینوا کی قدیم تہذیب دجلہ و فرات کے پانیوں پر سفر کرتی ہوئی سرزمین یونان میں پہنچی تو یہاں بھی ڈیلفی کے مندر کے باہر حسین دوشیزاؤں نے نوجوان یونانی سپاہیوں اور سیاحوں کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ پیشہ ور عورتیں دیواروں پر اپنا نام اور پتا عمر اور بالوں کی رنگت لکھ کر چلی جاتیں۔ نوجوان اپنی اپنی پسند کی عورت چن کر اُن کے پاس پہنچ جاتے۔ ان نوجوانوں میں اکثر دیوتا بھی ہوتے جو بعد میں ان پیشہ ور عورتوں کی محبت میں اُلجھ کر انہیں دنیا کے باقی سارے نوجوانوں سے محروم کر دیتے۔ اس لئے کہ انہیں ایسا کرنے پر قدرت حاصل تھی۔ اور وہ اپنے رقیب سے چھٹکارا حاصل کر سکتے تھے۔ یونانی داستان گو فیوبلس کی کہانیوں میں ایک ایسی ہی طوائف کی کہانی درج ہے۔ ہنری کی تحقیق کے مطابق یہ اس کی سب سے بہترین کہانی تھی اور خود اس کے بیان کے مطابق اس نے جس جگہ یہ کہانی سنائی عورتیں اس پر عاشق ہو جاتیں اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتیں یہاں تک کہ اس کے لئے ان عورتوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ اس طوائف کا نام فیوبلس نے فاریانہ لکھا ہے۔

## فریانہ کی داستان

فریانہ کی کہانی جیسا کہ ہنری ول کوکسن نے اپنی کتاب میں لکھی ہے اور جیسا کہ داستان گو فیوبلس اہل یونان کو سنایا کرتا تھا، دیوی سائیکی کی کہانی سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کہانیاں پرانے فراعنہ مصر کی سرزمین اور بنی اسرائیل کے قدیم داستانی ادب سے

سفر کرتی ہوئیں ان ہی داستان گوؤں کی وساطت سے یونان پہنچیں جنہیں بعد میں یونانی ڈرامہ نگاروں اور شاعروں نے اپنے فن پاروں کا موضوع بنایا۔ فریانہ ایک ماہی گیر کی بیٹی تھی۔ وہ بے حد حسین تھی۔ اس کے حسن کا شہرہ سارے ملک میں تھا۔ اس کی منگنی بچپن ہی میں ایک نوجوان ماہی گیر دریاکس سے ہو چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ دو برس بعد ان کی شادی ہونے والی تھی۔ فریانہ کا حسن اس کے لئے مصیبت کا باعث بن گیا۔ یہاں ہم کہانی کا کچھ حصہ قیولس کی اپنی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے لکھتے ہیں جیسا کہ ہنری نے کتاب میں درج کیا ہے۔

"۔۔۔ فریانہ کی آنکھیں نیلے پتھر تھیں۔ اس کے بالوں میں یمن کے گلاب کے شگوفوں کی خوشبو تھی۔ اس کے بال سنہری تھے اور سورج کی ساری کرنیں اس کے بالوں میں سمٹ آئی تھیں۔ وہ بات کرتی تو درختوں پر بیٹھی ہوئی بلبلیں چہچہانا بند کر دیتیں۔ وہ مسکراتی تو اپنی ڈالیوں پر کھلے ہوئے سفید پھول اپنی پنکھڑیاں سمیٹ لیتے۔ اس کے دانتوں پر سلامیز کے جزیرے میں اُگے ہوئے سفید انار کے دانوں کا گمان ہوتا۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ وہ سفید موتی ہیں جنہیں دیوتاؤں نے انہیں خاص طور پر عطا کیا ہے۔ فریانہ بہت حسین تھی۔ وہ ایک ماہی گیر کی بیٹی تھی۔ یہ موتی ایک میلے کچیلے سیپ میں بند تھا اور جب سیپ کا منہ کھلا تو اس کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی۔ دریاکس اس کا گرویدہ تھا۔ وہ اس کا ہونے والا شوہر تھا۔ فریانہ کے ماں باپ اسے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے تھے۔ اس لئے کہ کہیں دیوتا اس پر عاشق ہو کر اُسے اٹھا کر نہ لے جائیں۔ فریانہ کو بھی اپنی شکل صورت اور حسن پر بڑا ناز تھا۔ یہ ناز غرور بن گیا تھا۔ ایک روز وہ چشمے پر بیٹھی پانی کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ اتنے میں اُدھر سے ایک بوڑھے کا گذر ہوا۔ اس کی ایک بیٹی جو بدصورت تھی اور بیمار تھی گدھے پر سوار اس کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ بدصورت لڑکی کو پیاس لگی۔ بوڑھا اپنی بچی کو لے کر چشمے پر آیا تو فریانہ اس بدشکل لڑکی کی شکل دیکھ کر ڈر گئی۔ بوڑھے نے چشمے سے پانی لینا چاہا تو فریانہ نے اُسے ڈانٹ دیا اور کہا کہ وہ اپنی بدصورت بیٹی کو لے کر وہاں سے بھاگ جائے۔ نہیں تو دیوتا اس سے ناراض ہو جائیں گے۔ بوڑھا بے چارہ گھبرا گیا اور اپنی پیاسی بچی کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ دیوتاؤں نے آسمانوں پر فریانہ کی اس حرکت کو پسند نہیں کیا۔ انہوں نے اُسے بددعا دی کہ وہ اپنے حسن کی بدولت ساری زندگی مصیبت میں گرفتار رہے گی۔

اس واقعے کے کچھ روز بعد فریانہ اپنے ہونے والے شوہر دریاکس کے ساتھ ایک کشتی میں بیٹھی سمندر میں مچھلیاں پکڑ رہی تھی کہ آسمان پر بادل چھا گئے۔ مچھلیاں پکڑتے وہ سمندر میں کافی دور نکل گئے تھے۔ دریاکس نے آسمان پر بادلوں کی گرج چمک دیکھی تو کشتی کو واپس ساحل کی طرف لے جانے لگا۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے سمندر میں طوفان آ گیا۔ تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ بڑی بڑی لہریں اٹھنے لگیں۔ کشتی ایک تنکے کی طرح لہروں پر ہچکولے کھانے لگی۔ دریاکس نے کشتی کو طوفان سے بچانے کی بہت کوشش کی مگر دیوتاؤں کے آگے کس کی پیش گئی ہے۔ طوفانی لہروں نے کشتی کو الٹ کر رکھ دیا۔ دریاکس اور فریانہ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں میں گھر گئے۔ طوفان نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ بجلی زور سے چمکی۔ بادل زور سے گرجے اور دریاکس نے دیکھا کہ فریانہ الٹی ہوئی کشتی پر بیٹھی ہے اور اونچی اونچی لہریں اسے بہائے لئے جا رہی ہیں۔ دریاکس نے بہت شور مچایا۔ اس نے فریانہ کو، اپنی محبوبہ کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اسے نہ بچا سکا۔ سمندر کی طوفانی لہریں اُسے اپنے ساتھ لے کر کھلے سمندر کی طرف چلی گئیں اور پھر وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

فریانہ کے ماں باپ نے جب اپنی بچی کے انجام کی خبر سنی تو سر پیٹ کر رہ گئے۔ گاؤں کے لوگوں نے سمندر میں کشتیاں ڈالیں مگر لہروں نے انہیں واپس کنارے پر پٹخ دیا۔ دیوتاؤں کی یہی مرضی تھی کہ فریانہ کو اس کے غرور کی سزا دی جائے۔ اس نے ایک بوڑھے باپ کا دل توڑا تھا۔ اس کو اس گناہ کی سزا ملنی چاہئے تھی۔ سارا دن اور ساری رات سمندر میں طوفان رہا۔ دوسرے روز طوفان تھما تو دریاکس نے اپنی کشتی نکالی اور پُرسکون سمندر کی لہروں پر اپنی محبوبہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس نے کشتی کا رُخ سمندر میں اس جانب کر لیا جدھر فریانہ گئی تھی۔ اب ذرا فریانہ کی بھی سنو! کہتے ہیں کہ حسن کے سر پہ مصیبتوں کا سایہ ہوتا ہے۔ حسن مصیبت کا نشان ہے۔ فریانہ الٹی ہوئی کشتی سے چمٹی ہوئی تھی۔ طوفانی لہریں اُسے بہائے لئے جا رہی تھیں۔ ساری رات وہ بپھرے ہوئے سمندر میں کسی نامعلوم منزل کی طرف سفر کرتی رہی۔ دن چڑھا۔ طوفان تھما۔ بادلوں میں سے سورج دیوتا نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ حسین فریانہ کے سنہری بال بھیگے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں اور وہ کشتی پر بیٹھی اکیلی سمندر میں بہی چلی جا رہی تھی۔ سورج دیوتا نے بھی اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

کشتی سمندر میں سارا دن، ساری رات چلتی رہی۔ بھوک اور پیاس سے فریانہ کا برا حال ہو گیا تھا۔ آخر دوسرے دن جب کہ سنہری دھوپ ڈھل رہی تھی فریانہ کو دور سے ایک بادبانی جہاز اپنی طرف آتا نظر آیا۔ اس کے مردہ جسم میں امید کی کرن چمکی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اب وہ مرے گی نہیں۔ وہ اس جہاز پر سوار ہو کر واپس اپنے گاؤں پہنچ جائے گی۔ اس نے ہاتھ بلند کر کے ہلایا۔ مگر کمزوری کی وجہ سے اس کا ہاتھ اپنے آپ گر پڑا۔ اے کاش! جس جہاز کو وہ مسافروں کا جہاز سمجھ رہی تھی وہ ایک بحری ڈاکو، ایک خونخوار قاتل کا جہاز تھا جو اب تک سیکڑوں جہازوں کو لوٹ کر آگ لگا چکا تھا۔ ہزاروں بے گناہ مسافروں کو اپنی تلوار سے ہلاک کر چکا تھا۔ جہاز کا کپتان بحری ڈاکو بھی اپنے جہاز کے عرشے پر کھڑا تھا۔ اس نے دور سمندر میں کوئی شے تیرتی دیکھی تو اپنے جہاز کو اس کی بڑھایا۔ فریانہ نے جہاز کو قریب آتے دیکھا تو خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ ایک بحری ڈاکو اور قاتل کا جہاز ہے تو اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ بحری قزاقوں نے اپنے سردار کے حکم سے فریانہ کو اوپر جہاز پر اٹھا لیا۔ اُسے پینے کو میٹھا پانی اور کھانے کو روٹی دی گئی۔ دو چار دن کے علاج کے بعد فریانہ کا زندہ شکن حسن واپس لوٹ آیا۔

بحری قزاق فریانہ کے حسن کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس نے فریانہ سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آ رہی ہے؟ فریانہ نے اپنی دردبھری کہانی من و عن بیان کر دی۔ بحری قزاق نے اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ کر زور سے ایک قہقہہ لگایا اور کہا کہ اب اپنے ماں باپ کو بھول جاؤ۔ اب تم ساری زندگی ان کی شکل نہ دیکھ سکو گی۔ تمہیں باقی عمر اسی جہاز میں میری بیوی بن کر رہنا ہوگا۔ فریانہ پہ تو گویا بجلی گر پڑی۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ بحری قزاق کو بڑا غصہ آیا۔ وہ کسی عورت کو آنسو بہاتا نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس نے زور سے فریانہ کے منہ پر طمانچہ مارا۔ فریانہ چیخ مار کر لڑکھڑائی اور عرشے پر گر پڑی اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا اس کے بعد فریانہ کو کبھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ بحری ڈاکو کے آگے آنسو بہا سکے۔ ہاں رات کو جب وہ اکیلی ہوتی تو اپنے ماں باپ اور منگیتر دریاکس کو یاد کر کے ضرور آنسو بہایا کرتی بحری ڈاکو کا خونی جہاز سمندر میں سفر کرتا رہا۔ ایک روز اس کا مقابلہ ایک مسافر بردار جہاز سے ہو گیا۔ اس جہاز میں کچھ سپاہی بھی سفر کر رہے تھے۔ بڑی خونریز لڑائی ہوئی۔ لیکن مسافر نہتے تھے۔ سپاہی تھوڑے تھے۔ ڈاکو زیادہ تھے۔ ڈاکوؤں نے مسافر بردار جہاز پر قبضہ کر کے اُسے لوٹنا شروع کر دیا۔ پھر انہوں نے سارے مسافروں اور سپاہیوں کو اُن کے جہاز پر کھڑا کر کے باری باری قتل کر دیا اور جہاز کو آگ لگا کر کھلے سمندر میں چھوڑ دیا۔ فریانہ یہ ماجرا

دیکھ کر سہم گئی۔ وہ اتنی ڈر گئی کہ اُسے اب کبھی جرأت نہ ہوئی کہ بحری قزاق سے کھل کر بات کر سکے یا اس کے کسی حکم کو ٹال سکے۔

## محبوب کی سرگزشت

فریانہ کا محبوب دریاکس برابر اپنی کشتی پر سمندر میں سفر کر رہا تھا۔ وہ فریانہ کی یاد میں بے چین تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کی محبوبہ کا کیا انجام ہوا ہے۔ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ اگر زندہ ہے تو کس حال میں ہے!

——— بحری ڈاکوؤں کا جہاز چار پانچ دن کے سمندری سفر کے بعد آخر ایک ایسے خفیہ جزیرے کے کنارے جا کر رُک گیا جسے بحری ڈاکوؤں نے ہی آباد کر رکھا تھا۔ یہاں ان کی عورتیں اور بچے رہتے تھے۔ یہاں آ کر وہ کچھ دیر اپنے گھر بار والوں کے ساتھ رہتے۔ تازہ میٹھا پانی اور خوراک کا ذخیرہ حاصل کرتے اور دوبارہ اپنے خونی سفر پر روانہ ہو جایا کرتے تھے۔ فریانہ بڑی خوش ہوئی کہ وہ کسی جزیرے پر پہنچ گئی ہے۔ اسکا خیال تھا کہ وہ اس جزیرے پر کسی نہ کسی طرح سے اُتر کر چھپ جانے کی کوشش کرے گی۔ اس وقت تک چھپی رہے گی جب تک کہ بحری ڈاکوؤں کا جہاز وہاں سے روانہ نہیں ہو جاتا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ جزیرہ سارے کا سارا بحری قزاقوں سے آباد ہے۔ جب اس پر یہ حقیقت آشکار ہوئی تو وہ دِل پکڑ کر رہ گئی۔ سارے کے سارے بحری قزاق اپنے اپنے گھر بار والوں سے ملنے اور انہیں لوٹے ہوئے تحفے تحائف دینے جہاز سے اتر کر گھروں کو چلے گئے۔ بحری قزاقوں کا سردار بھی جہاز پر سے چلا گیا۔ لیکن جاتے جاتے وہ فریانہ کو ایک کوٹھڑی میں بند کر کے باہر تالا لگا گیا اور ایک ڈاکو کو ننگی تلوار دے کر پہرے پر بھی بٹھا گیا تاکہ وہ فریانہ کی خبر گیری کرتا رہے۔ فریانہ نے بے تاب ہو کر کوٹھڑی کی سلاخوں میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ دُور ساحل پر رنگ برنگ لباس والے مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ فریانہ کو اپنے ماں باپ اور محبوب یاد آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اکیلی تھی۔ اس لئے دیر تک روتی رہی۔

رو لینے سے اس کے دل کا غبار دُھل گیا۔ ذہن بھی صاف ہو گیا اور اب اس نے وہاں سے فرار ہونے کی ترکیبوں پر غور شروع کر دیا۔ مگر وہ اکیلی وہاں سے کیسے بھاگ سکتی تھی۔ ایک خادمہ اُسے کھانا دینے آتی تھی۔ فریانہ نے اُسے ہمراز بنانے کی کوشش کی مگر وہ بحری ڈاکوؤں سے بے حد خوفزدہ تھی۔ اس نے فریانہ سے صاف صاف کہہ دیا۔

”اے اجنبی حسینہ! میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ لیکن اتنا ضرور بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم اگر چاہو بھی تو ان ڈاکوؤں کے چنگل سے بچ کر نہیں نکل سکتیں۔ یہ جزیرہ ان کا اپنا جزیرہ ہے۔ یہاں اگر تم کسی غار میں بھی چھپی ہو گی تو وہ غار تمہاری مخبری کر دے گا۔“

لیکن فریانہ مایوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ بڑی ہمت والی لڑکی تھی۔ اُس نے ایک نوجوان ڈاکو پر اپنے حُسن کا جال پھینکا۔ یہ جال اس قدر خطرناک تھا کہ وہ ڈاکو اس کے پھندے میں پھنس گیا۔ فریانہ نے اُسے کہا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور بحری سردار سے نفرت کرتی ہے۔ وہ اُسے بھگا کر لے جائے۔

نوجوان ڈاکو نے کہا۔

”میں بھی تم سے پیار کرتا ہوں۔ جب سے تم اس جہاز پر آئی ہو میں اس وقت سے تمہیں پیار کرتا ہوں۔ لیکن سردار کی سنگدلی کی وجہ سے مجبور ہوں۔“

فریانہ نے اسے شرم اور غیرت دلائی۔ یہاں تک کہ نوجوان ڈاکو اُسے بھگا لے جانے پر راضی ہو گیا۔ جہاز ابھی تک جزیرے پر کھڑا تھا۔ نوجوان ڈاکو نے فریانہ کو بتایا کہ وہ اس جزیرے پر اُسے بھگا کر نہیں لے جا سکتا۔ یہ سارے کا سارا جزیرہ بحری ڈاکوؤں کی ملکیت ہے اور یہاں وہ جس جگہ پر بھی ہوں گے انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اب یہی ایک صورت ہے کہ جب یہ جہاز کسی دوسرے جزیرے کے قریب سے گذرنے لگے تو وہ اُسے سمندر میں کشتی میں سوار کروا کر اتر جائے اور جزیرے پر جا لگے۔ اُسے اس علاقے کے سارے جزیروں کی خبر تھی اور وہ اُن کے فاصلوں سے بھی واقف تھا۔ فریانہ کے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن تو چمکی تھی۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اگرچہ نوجوان ڈاکو کو معلوم تھا کہ پکڑا گیا تو اس کی گردن کاٹ کر اسکا سر جہاز کے مستول کے ساتھ لگا دیا جائے گا۔ لیکن فریانہ کے حُسن نے اسے موت کے ساتھ کھیلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

## داستان کا عروج

دس پندرہ دن خونی جزیرے پر قیام کرنے کے بعد بحری ڈاکوؤں کے جہاز نے وہاں سے کوچ بول دیا۔ بادبان کھول دیئے گئے اور جہاز نے کھلے سمندر کی طرف سفر شروع کر دیا۔ نوجوان ڈاکو اب موقع کی تلاش میں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اگر جہاز اسی رفتار سے چلتا رہا تو ٹھیک چار دن کے بعد تیسرے پہر وہ ایک سمندر میں ابھرے ہوئے پہاڑ کے قریب سے گذرے گا۔ بس یہی وہ مقام تھا جہاں اس نے اپنی محبوبہ کے ساتھ سمندر میں اترنا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ ایک کشتی کو سمندر میں چپکے سے پھینک دے گا۔ پھر اپنی محبوبہ کے ساتھ سمندر میں چھلانگ لگا دے گا اور پانی میں تیرتے ہوئے کشتی میں جا کر سوار ہو جائے گا۔ اس مقصد کے لئے اس نے جہاز کے عرشے پر رسّوں سے بندھی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈونگا نما کشتی کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ ہر روز وہ اس کشتی کے قریب سے گذرتے ہوئے چاقو سے اس کی ایک آدھ رسّی کاٹ دیتا تھا۔ اس نے اپنا سارا لائحہ عمل فریانہ کو بتا دیا تھا اور اسے کہا تھا کہ وہ دو روز کے بعد تیار ہو جائے۔ تیسرے روز نوجوان ڈاکو نے فریانہ سے خُفیہ ملاقات کی اور اُسے کہا۔

”کل شام ہمارا جہاز اس پہاڑ کے قریب سے گزرنے والا ہے۔ یہ پہاڑ سمندر کے بیچ سے ابھرا ہوا ہے۔ یہاں کوئی آبادی نہیں ہے۔ لیکن یہاں سے دو سو میل دور جنوب میں ایک جزیرہ آباد ہے۔ اس جزیرے پر اچھے لوگ رہتے ہیں اگر ہم وہاں پہنچ گئے تو وہاں سے بڑی آسانی سے کسی مسافر جہاز پر سوار ہو کر افریقہ یا مصر کی طرف نکل جائیں گے اور شادی کر کے نئی زندگی شروع کریں گے۔“

فریانہ اس کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے پر ہرگز تیار نہیں تھی۔ وہ تو اس نوجوان ڈاکو کو وہاں سے فرار ہونے کے لئے ایک ہتھیار کی طرح سے استعمال کر رہی تھی۔ پھر بھی اس نے اسے کہا کہ ہاں وہ تیار ہے اور اسی کے ساتھ اب باقی زندگی بسر کرے گی۔

اس رات نوجوان ڈاکو نے کشتی کے سارے رسّے سوائے ایک رسّی کے کاٹ دیئے۔ دوسرے روز آسمان پر بادل آ گئے۔ موسم خراب ہو گیا۔ نوجوان ڈاکو نے اسے اپنے لئے اچھا شگون سمجھا۔ کیونکہ خراب موسم کی افراتفری میں بھاگنا زیادہ آسان تھا۔ فریانہ بھی بالکل تیار تھی۔ اس نے صبح ہی سے ناسازیٔ طبع کا بہانہ بنا لیا تھا اور اوپر عرشے پر کھلی ہوا میں آ گئی تھی۔ وہ فرار میں مدد دینے والی کشتی کے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ شام ہو گئی تو سامنے سمندر میں وہ پہاڑ نظر آنے لگا جہاں بھاگ کر انہوں نے جانا تھا اور جو فریانہ کی آزادی کا نشان تھا۔ ٹھیک اس وقت نوجوان ڈاکو ادھر سے گذرا اُس نے قریب سے گذرتے ہوئے جھک کر فریانہ کے کان میں کہا کہ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ جہاز پر سے فرار ہو جائیں گے۔ فریانہ نے سر کا اشارہ کر کے اثبات میں جواب دیا۔ لیکن بدقسمتی سے اُسے بحری سردار نے نیچے بلا لیا۔ وہ بادل نخواستہ اٹھ کر بحری قزاق کے

سردار کے کیبن میں آگئی۔ بحری قزاق نے اس کے ہاتھ میں صراحی دے کر اسے شراب پلانے کے لئے کہا۔ فریانہ اس کے آگے دم نہ مار سکتی تھی۔ اس نے صراحی اپنے ہاتھ میں لے لی اور اسے شراب پلانے لگی۔ کم بخت چاہے جتنی پی لے۔ اسے کبھی آغا نشہ نہیں ہوا تھا کہ بے ہوش ہو جائے۔ وہ دیر تک مے نوشی کا شغل کرتا رہا اور پھر اس نے فریانہ کو اپنی گود میں بٹھا لیا اور اس کے سنہری بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ فرار کا وقت آگیا تھا۔ اس سے بہتر موقع انہیں پھر کبھی میسر نہیں آسکتا تھا۔ نوجوان ڈاکو اوپر عرشے پر آیا۔ تیز ہواؤں کی وجہ سے یہاں کوئی نہ تھا۔ بڑا اچھا موقع تھا۔ لیکن جس شے کی اس نوجوان ڈاکو کو تلاش تھی وہ بھی وہاں نہیں تھی۔ وہ پریشان ہوگیا۔ اسے معلوم ہوا کہ فریانہ سردار کے پاس گئی ہوئی ہے۔ سردار کے پاس سے فریانہ کو بلانا شیر کے منہ سے نوالہ چھیننے والی بات تھی۔ وہ صبر کر کے بیٹھ گیا۔ اُسے اپنے سارے کئے کرائے پر پانی پھرتا محسوس ہونے لگا۔ لیکن ٹھیک اس وقت فریانہ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنا خوبصورت سنہری جسم سیاہ چادر میں ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ سردار کو نیند کی آغوش میں دھکیل کر اوپر آگئی تھی۔ نوجوان ڈاکو نے اُسے دیکھا تو اس کی جان میں جان آگئی۔ اس نے اُسے بازو سے پکڑا اور ایک طرف لے جا کر بتایا کہ اب وہ کشتی سمندر میں پھینکنے والا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں باری باری سمندر میں چھلانگیں لگا دینی ہوں گی۔ فریانہ کو رات کے اندھیرے میں سمندر سے خوف آتا تھا۔ لیکن آزادی ایسی نعمت کی قدر وہ خوب جانتی تھی۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی اس ظالم سردار کی قید حیات سے رہائی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے نوجوان عاشق سے کہا کہ وہ تیار ہے۔ کشتی اپنے اکیلے رسّے کے ساتھ بندھی ہوا میں ڈول رہی تھی۔ نوجوان ڈاکو نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر فریانہ سے کہا۔

"موقع بڑا اچھا ہے۔ تم ایسا کرو کہ اس کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اب تمہیں سمندر میں چھلانگ لگانے کی ضرورت نہیں۔ جلدی کرو۔ اگر کوئی ڈاکو اوپر آگیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔"

فریانہ جلدی سے کشتی میں سوار ہوگئی۔ نوجوان ڈاکو نے کشتی کی رسّی کو کھول کر اُسے سمندر میں لٹکا دیا۔ کشتی سمندر کی لہروں پر جا کر ٹک گئی۔ نوجوان ڈاکو نے اوپر سے رسّی کاٹ دی۔ کشتی تیز لہروں پر پیچھے کو رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بھی سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ وہ ایک بڑا ماہر تیراک تھا اور اس کی ساری زندگی سمندر کی لہروں پر تیرتے گذری تھی۔ وہ بہت جلد تیرتا ہوا اس کشتی تک پہنچ گیا جس میں اس کی محبوبہ اس کی زندگی کی روشنی سوار تھی۔ فریانہ نے بحری ڈاکوؤں کے جہاز کی روشنیوں کو دُور سمندر میں گم ہوتے دیکھا تو خوشی سے اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ آج وہ ایک بن مانس کی قید سے آزاد ہوئی تھی۔ اب وہ اس نوجوان ڈاکو سے بڑی آسانی سے چھٹکارا حاصل کر سکتی تھی۔ نوجوان نے کشتی کو پہاڑ کی طرف کھینا شروع کر دیا۔ یہ پہاڑ وہاں سے کوئی دس بارہ میل کے فاصلے پر تھا اور رات کے اندھیرے میں ایک بہت بڑے عفریت کی مانند لگ رہا تھا۔

## داستان در داستان

تھوڑی دیر بعد ہی ان کی کشتی پہاڑ کے پہلو میں پہنچ گئی۔ نوجوان ڈاکو کشتی کو ایک خلیج میں سے نکال کر پہاڑ کی دوسری جانب لے گیا۔ یہاں اس نے کشتی کو ایک غار کے اندر چھپا دیا۔ کشتی میں اس نے پہلے ہی سے کھانے پینے کا سامان چھپا رکھا تھا۔ انہوں نے پتھروں کے بیچ میں آگ روشن کر کے قہوہ گرم کر کے پیا۔ پھر فوراً ہی آگ بجھا دی گئی۔ انہوں نے پہاڑ پر چڑھ کر سمندر میں دیکھا۔ ان کا جہاز وہاں سے کافی دور جا چکا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی کہ فریانہ اور نوجوان ڈاکو اس جہاز کے سنگدل خونی سردار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جہاز سے فرار ہو چکے ہیں۔ نوجوان ڈاکو نے فریانہ سے کہا کہ رات انہیں اسی جگہ بسر کرنی ہوگی۔ صبح وہ وہاں سے جنوب کی طرف اپنا سفر شروع کریں گے اور چار روز کے سفر کے بعد اس جزیرے پر جا پہنچیں گے جہاں بحری ڈاکو اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے فریانہ وہاں اکیلی رات بسر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جلدی سے جلدی جزیرے پر پہنچنا چاہتی تھی۔ اس نے نوجوان ڈاکو سے کہا۔

"دن کے وقت یہاں سے نکلنے میں خطرہ ہے۔ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں نہ ہم اسی وقت یہاں سے نکل چلیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر سردار کو میرے فرار کا علم ہوگیا تو ہماری تلاش میں جہاز لے کر راتوں رات یہاں پہنچ جائے گا۔"

نوجوان ڈاکو ہنس پڑا۔ اس نے فریانہ کی ہمت بندھائی اور کہا کہ سردار کو صبح ہونے سے پہلے کسی صورت میں اُن کے فرار کا علم نہ ہو سکے گا۔ دوسرے رات کو سمندر میں سفر کرنے سے وہ راستہ بھول جائے گا کیونکہ آسمان پر بادل چھائے ہیں اور قطب ستارہ جو راہ دکھاتا ہے غائب ہے۔ اس دلیل کے آگے فریانہ کچھ نہ کہہ سکی۔ نوجوان نے پتھروں میں ایک جگہ بنائی جہاں فریانہ سونے کی کوشش کرنے لگی اور ذرا پرے نوجوان ڈاکو لیٹ گیا۔ وہ اتنا بے فکر اور مطمئن تھا کہ لیٹتے ہی خراٹے بھرنے لگا۔ کچھ دیر فریانہ اپنی پچھلی اور آنے والی زندگی پر غور کرتی رہی اور پھر اُسے بھی نیند آگئی۔

داستان گو اپنی کہانی کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یونان کی حسین ترین دوشیزہ بحری ڈاکوؤں کے سردار کو سوتا چھوڑ آئی تھی۔ لیکن بدقسمتی اس حسین عورت کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ دیوتاؤں کی بددعا اپنا کام کر گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی سردار کی نیند کھل گئی۔ اس نے خادمہ کو کہا کہ فریانہ کو حاضر کیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد خادمہ نے آکر بتایا کہ فریانہ سارے جہاز پر کہیں بھی نہیں ہے۔ سردار آگ بگولا ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے تلوار بے نیام کر لی اور جہاز کے عرشے پر آگیا۔ یہاں آکر یہ بھید کھل گیا کہ جہاز کی ایک کشتی غائب ہے۔ اور ایک نوجوان ڈاکو بھی غائب ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ دونوں جہاز پر سے فرار ہوگئے ہیں۔ سردار نے چیخ مار کر کہا جہاز کو واپس پہاڑ کی طرف موڑا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ مفرور اسی جگہ چھپے ہوں گے۔ جہاز کا رُخ واپس موڑ دیا گیا۔ سردار کے حکم سے ساری روشنیاں گل کر دی گئیں تاکہ دُور سے مفرور جوڑے کو یہ پتہ نہ چل جائے کہ جہاز اُن کے تعاقب میں واپس آرہا ہے۔ سردار کی یہ چال بڑی کامیاب رہی۔ جہاز بڑی خاموشی سے ٹھیک اس مقام پر آگیا جہاں سے فریانہ اور نوجوان ڈاکو نے سمندر میں چھلانگ لگائی تھی۔ جہاز کا لنگر سمندر میں پھینک دیا گیا۔ بادبان لپیٹ دیئے گئے۔ ابھی رات ایک پہر باقی تھی۔ بحری ڈاکوؤں کا سردار اپنے ساتھ کچھ ڈاکوؤں کو لے کر کشتی میں سوار ہو کر سمندر میں اُترا اور اس نے پہاڑ کے دامن کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

واہ ری قسمت! اُحسن پہاڑ کے دامن میں بڑا غافل سوتا تھا کہ موت اُس کے سر پر پہنچ گئی۔ فریانہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کا نوجوان عاشق بھی ایک طرف دنیا و مافیہا سے بے نیاز پڑا بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔ بحری قزاق اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے دونوں کی تلاش شروع کر دی اور آخر اس مقام پر پہنچ گیا جہاں دونوں عاشق سو رہے تھے۔ فریانہ کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو بحری ڈاکوؤں کے نرغے میں پایا۔ غم سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ نوجوان عاشق بھی بیدار ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ سردار نے اُسے اُٹھنے کی مہلت ہی نہ دی اور تلوار کے ایک ہی وار سے نوجوان ڈاکو کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ دوسرا وار وہ فریانہ پر کرنے ہی والا تھا کہ اس کی تلوار اوپر اُٹھی کی اُٹھی رہ گئی۔ اس نے فریانہ کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور ڈاکوؤں کو حکم دیا کہ اسے لے کر جہاز پر پہنچا دو۔ نوجوان عاشق کی لاش اسی جگہ تڑپتی چھوڑ کر یہ لوگ واپس جہاز پر آگئے۔ فریانہ

کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ اُسے کسی وقت بھی اس کوٹھڑی سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ جہاز ایک بار پھر اپنے سفر پہ روانہ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس حسین لڑکی کی قسمت پہ مہر ثبت ہو چکی ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو گی اور ہمیشہ پریشان اور فلاکت زدہ ہی رہے گی۔

## قصہ دریاکس کا

ہنری وِل کوکسن اپنی کتاب میں یونانی داستان گو فیوس کی زبان سے اس کہانی کو یوں آگے بیان کرتا ہے کہ فریانہ کا منگیتر دریاکس اپنی کشتی میں سوار فریانہ کی تلاش میں برابر سمندر میں سفر کر رہا تھا۔ آخر وہ سفر کرتے کرتے سمندری تھپیڑوں کی مار سہتے سہتے اس پہاڑ کے قریب پہنچ گیا جہاں اسکی منگیتر فریانہ کے نوجوان عاشق کو قتل کیا گیا تھا۔ دریاکس کے پاس ابھی خوراک کا کچھ ذخیرہ موجود تھا۔ صرف پانی ختم ہونے والا تھا۔ اس نے دُور سے پہاڑ کو سمندر میں ابھرے دیکھا تو سوچا کہ وہاں چل کر پانی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ وہ کشتی کو لے کر پہاڑ کے دامن میں آ گیا۔ وہ بھی جنوب مشرق کی سمت سے پہاڑ کے دامن میں داخل ہوا اور خلیج عبور کر کے کشتی کو اس غار کے دہانے پہ لے آیا جہاں فریانہ کے نوجوان عاشق نے اپنی کشتی کو باندھا تھا۔ دریاکس نے کشتی ایک پتھر سے باندھی اور پانی کی تلاش میں پہاڑ کے جزیرے پہ اُتر آیا۔ وہ تھوڑی دُور ہی گیا ہو گا کہ اس نے ایک لاش دیکھی جسکے دو ٹکڑے پاس پاس پڑے تھے۔ لاش کو کیڑوں نے کافی کھا لیا تھا۔ اس نے زمین پر دیکھا اُسے کئی لوگوں کے قدموں کے نشان دکھائی دیئے۔ ان میں وہ اپنی محبوبہ اور منگیتر کے پاؤں کے نشان نہ پہچان سکا۔ وہ چلتا چلتا اس جگہ پہ آ کر رُک گیا جہاں اس کی منگیتر فریانہ نے لیٹ کر آرام کیا تھا۔ اُسے یُوں لگا جیسے اُسے اپنی محبوبہ کے جسم کی خوشبو آئی ہو۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور فریانہ کو یاد کیا۔ زمین پر فریانہ کی ایک بھی نشانی نہ تھی جسے دیکھ کر اُسے منگیتر کا خیال آتا۔

دریاکس نے جزیرے میں اِدھر اُدھر گھومنا شروع کر دیا۔ یہ بڑا ہی چھوٹا سا جزیرہ تھا جہاں صرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ ایک بھی درخت یا چشمہ نہیں تھا۔ بڑی تلاش کے بعد اُسے ایک غار میں سے پانی مل گیا۔ پانی کشتی میں رکھ کر اس نے قریب جا کر لاش کو بڑے غور سے دیکھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ لاش کسی بحری ڈاکو کی ہے۔ جسے دوسرے ڈاکو وہاں لا کر قتل کر گئے تھے۔ اس کو کیا خبر تھی کہ اس قتل کی اصل وجہ اس کی منگیتر فریانہ ہی تھی۔ دریاکس سفر کرتے کرتے بہت تھک گیا تھا۔ اس نے وہاں رات بھر آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک جگہ پتھروں میں خشک جھاڑ جھنکاڑ جمع کر کے اس نے آگ جلائی اور خشک [illegible] کے کھائی، پانی پیا اور سو گیا۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو رات کافی گذر چکی تھی۔ [illegible] تھا اور اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ جزیرے پر سناٹا [illegible] تھا۔ پہاڑ کسی بہت بڑے عفریت کی طرح پراسرار طور پر خاموش تھا۔ دریاکس [illegible] آنکھیں کھولے آسمان پہ چمکتے جھلملاتے ستاروں کو تکنے لگا۔ اچانک اس نے [illegible] تھوڑی دیر بعد کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ وہ ہمہ تن گوش [illegible] لگ رہا تھا جیسے کوئی شے دبے پاؤں اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ ایک دم سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور اُٹھ کر پہاڑ کی اوٹ میں آ کر چھپ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے وہاں جو منظر دیکھا اس کی دہشت سے اس کی چیخ نکلتے نکلتے [illegible]۔ وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہاں ایک بہت بڑا ریچھ نما جانور [illegible] جگہ کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں وہ سو رہا تھا۔ شاید اس کی بُو اس بھیانک جسم [illegible] جانور کو اُدھر کھینچ لائی تھی۔ دریاکس نے خنجر کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

لیکن اُسے خوب معلوم تھا کہ وہ اتنے بڑے جانور کا وہ اکیلا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ یہ ریچھ دونوں پاؤں پر کھڑا تھا اور دوسرے ہاتھوں سے برابر اپنا سینہ پیٹ رہا تھا جس کی آواز پیٹے ہوئے ڈھول کی سی بلند ہو رہی تھی۔

## دیومالائی اژدہا

ریچھ دریاکس کو وہاں نہ پا کر پریشان ہو رہا تھا کہ اچانک پہاڑ کے دامن میں ایک زبردست پھنکار کی آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز اس قدر بھیانک تھی کہ دریاکس کو ایک بار تو پسینہ آ گیا۔ ناگہاں کیا دیکھتا ہے کہ سامنے والی چٹان کے عقب سے ایک اژدہا برآمد ہوا اور ریچھ کی طرف بڑھا۔ اژدہا کا چہرہ بڑا مکروہ اور بھیانک تھا اور اسکی دو زبانیں بار بار اس کے حلق سے باہر نکل کر لہرا رہی تھیں۔ ریچھ نے بھی اپنے دشمن کو سامنے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی چوکس ہو گیا۔ دونوں دشمن ایک دوسرے کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے اور حملے کا موقع تلاش کرنے لگے۔ دریاکس ایک ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اژدہا نے ریچھ کے اردگرد چکر لگانا شروع کر دیا۔ جدھر اژدہا کا منہ ہوتا اُدھر ہی ریچھ اپنا منہ کر لیتا۔ وہ بھی حملے کے جواب کے لئے تیار تھا۔ اژدہا کے حلق سے غراہٹ قسم کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ریچھ نے اب بار بار چیخنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے وہ کسی کو مدد کے لئے بلا رہا ہو۔ اژدہے نے ایک مقام پہ رُک کر اچانک ریچھ کی گردن پہ حملہ کر دیا۔ ریچھ جھک گیا اور اپنے پنجے کو اٹھا کر اژدہا کی گردن پہ مارا۔ اسکے ناخن اس قدر تیز تھے کہ اژدہا کی گردن زخمی ہو گئی اور خون بہنے لگا۔ اژدہا انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں آ گیا۔ اُس نے لپک کر منہ آگے بڑھایا اور ریچھ کی تھوتھنی اپنے منہ میں لے لی۔ خدا جانے اس کے منہ کے اندر کس قدر گرمی اور زہر تھا کہ ریچھ اچھل اچھل کر تڑپنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اژدہا بھی اچھلنے اور تڑپنے لگا۔ مگر اس دوران ریچھ اپنا کام کر چکا تھا۔ اس نے اپنے نیزوں ایسے تیز ناخنوں سے اژدہا کی موٹی گردن کو ادھیڑ ڈالا تھا اور اُسے خون خون کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب اژدہا نے ریچھ کی تھوتھنی کو چھوڑا تو اژدہا کی آدھی گردن کٹ کر ڈھلک گئی تھی اور دریاکس یہ دیکھ کر لرز گیا کہ ریچھ کی پوری کی پوری تھوتھنی غائب تھی۔

ادھر اژدہا زمین پر گرا، اور اُدھر ریچھ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ دونوں موت کی طرف بڑھنے لگے۔ زمین پر لیٹے لیٹے اژدہا نے آخری وار کیا۔ اس نے گردن اٹھا کر ریچھ کے پیٹ پر حملہ کیا۔ مگر اس کی گردن زمین پر گر پڑی۔ ریچھ نے بھی اپنا آخری وار کیا اور اژدہا کے سر پہ پنجہ مار کر اس کے سر کو گردن سے الگ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں مر گئے۔ مرنے کے بعد بھی دونوں کی لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ جب دریاکس کو یقین ہو گیا کہ وہ دونوں ٹھنڈے ہو چکے ہیں تو وہ ٹیلے کی اوٹ سے نکلا اور دونوں بھیانک جانوروں کے قریب آیا۔ اگرچہ وہ مر چکے تھے پھر بھی ان کے قریب آتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ دریاکس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہاں سے بھاگ نکلا جائے۔ چنانچہ وہ لپک کر اپنی کشتی کی طرف بڑھا۔ غار کے دہانے پر کشتی اسی طرح کھڑی تھی۔ وہ جلدی سے اس میں سوار ہو گیا اور اُسے لہروں پہ کھیتا کھلے سمندر میں لے گیا۔ (یہاں ہنری وِل کوکسن نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ اژدہا اور ریچھ بعد میں دیوتاؤں کے نام اور شکلیں اختیار کر کے یونان کی دیومالا کا حصہ بن گئے۔ چنانچہ یونانی میں لکھی جانے والی بعض شاعروں کی نظموں میں اس اژدہا اور ریچھ کا ذکر ملتا ہے) دریاکس کی داستان اب آگے بڑھتی ہے۔ وہ سمندر میں اپنی محبوبہ کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ کوئی چار دن کے بعد آخر وہ اسی جزیرے کے قریب آ گیا جہاں سب کی سب بحری ڈاکوؤں کی اولاد آباد تھی اور جہاں تھوڑے دن پہلے بحری ڈاکوؤں کا جہاز لنگر انداز ہوا تھا۔

دریاکس کی کشتی جزیرے کے مغربی کنارے پر جا کر لگی۔ یہاں سمندری چٹانیں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ پانی کی لہروں کا بہاؤ بڑا تیز تھا۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ کشتی پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئی۔ ویسے بھی اب وہ طویل سمندری سفر کے لائق نہ رہی تھی۔ دریاکس نے وہیں کشتی سمندری لہروں کے حوالے کر دی اور خود جزیرے پر آگیا۔ اس جزیرے پر کبھی کوئی مسافر بردار جہاز نہ آیا تھا نہ کشتی بھی نہ آئی تھی۔ اتفاق سے دریاکس کی کشتی گمنام اور ویران سے ساحل پر آکر لگی تھی نہیں تو وہاں لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا۔ دریاکس کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ وہ ایک عجیب و غریب جزیرے پر آگیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ وہاں عورتیں اور بچے زیادہ تھے۔ مرد جو بھی نظر آتا وہ بوڑھا ہی دکھائی دیتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس جزیرے کے سارے کے سارے جوان بحری قزاقوں کے جہازوں پر ملازم تھے۔ لوگ بھی اس کی طرف حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک قہوہ خانے میں داخل ہو گیا۔ اس کے پاس سونے کے چند ایک ٹکڑے رہ گئے تھے۔ یہاں اس نے غسل کر کے کھانا کھایا۔ پھر ایک دکان سے نئے کپڑے خرید کر پہنے۔ اب اس پر ساری حقیقت کا انکشاف ہو چکا تھا اور وہ اس جزیرے میں آکر پچھتا رہا تھا۔ کیونکہ یہاں سے وہ کسی بھی جہاز میں سوار ہو کر واپس نہ جا سکتا تھا۔ سوائے بحری قزاقوں کے جہاز کے۔ جس میں موت کا دھڑکا لگا تھا۔

## کہانیوں کے جزیرے

ڈاکٹر اعظم کریوی اپنے ایک مضمون مطبوعہ "آجکل" میں لکھتے ہیں کہ داستان گوئی نے دو ہزار برس قبل از مسیح یونان میں اپنے عروج کا دور دیکھا۔ اور یہاں کے چھوٹے چھوٹے جزیرے ان کہانیوں کی آماجگاہ رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس دعوے کی تصدیق ایک کتاب نے کی۔ یہ کتاب ون ووڈ ریڈ کی لکھی ہوئی ہے اور اس کا نام ہے "The Martyr dome OF man" اس کتاب میں یہ انگریز مصنف آج سے ٹھیک ایک سو برس پہلے لندن کے ایک گمنام محلے میں بیٹھ کر لکھتا ہے کہ یونان کے بحری ملاح جب دور دراز سمندری سفروں سے واپس اپنے اپنے جزیروں میں آتے تو اپنے ساتھ بے شمار کہانیاں لاتے۔ پھر لوگ ان کے گرد سرِ شام کھانا وغیرہ کھا کر جمع ہو جاتے۔ ملاحوں کو بھی اپنے سفر کے دلچسپ واقعات سنانے کا شوق ہوتا۔ چنانچہ وہ اپنی کہانیوں اور سفرناموں کو خوب نمک مرچ لگا کر سناتے۔ اگر کسی جگہ صرف طوفان نے اُن کے جہاز کو گھیرا ہوتا تو ملاح کہتا کہ سمندر کی ایک طوفانی لہر نے انہیں طوفان میں اُچھال دیا اور پھر بڑی مشکل سے تیر کر وہ واپس جہاز پر آیا۔ یوں سفرناموں نے مبالغہ آمیزی اور کہانی کا رنگ اختیار کر لیا۔ خاص طور پر زیادہ باتونی اور پھرتباز ملاح تو اس قدر زیادہ مبالغہ آمیزی کرنے لگے کہ اُنکے سفرناموں کو سن کر محسوس ہوتا کہ وہ کسی جناتی سفر سے واپس آئے ہیں یا وہ کسی جناتی مہم کے ہیرو ہیں اور صرف ان ہی کی خاطر جہاز نے سفر کی ساری صعوبتیں اٹھائی تھیں۔ خاص طور پر کریٹ کے جزیرے ان داستان گوؤں کی آماجگاہ بنے۔ یہ فن انہوں نے فونیقوں سے بھی لیا تھا جو بحیرہ روم میں تاریخ کے پہلے ملاح تصور کئے جاتے ہیں۔ جہاز رانی اور قصہ گوئی اس کی پوری روایت یونانیوں نے اپنی دیومالا میں جذب کی اور یوں یہ فن یہاں نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا۔

چنانچہ یونان کا عظیم قصہ گو فیولس اپنی داستان کو جس کو کہ بعض غیر ملکی محققین نے دنیا کی چند ایک بہترین داستانوں میں شمار کیا ہے، بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دریاکس بحری قزاقوں کے اس جزیرے پر آکر پچھتانے لگا۔ لیکن اب وہ وہاں آچکا تھا اور واپسی کا کوئی بھی ذریعہ اس کے پاس نہیں تھا۔ رات سر پہ آگئی۔ جزیرے پر اندھیرا چھا گیا۔ مکانوں اور دکانوں میں ہلکی ہلکی روشنیاں ہو گئیں۔ آخر ایک بوڑھے نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس جزیرے پر کیسے آیا ہے۔ دریاکس نے شروع سے لے کر اپنی ساری کہانی حرف بہ حرف بیان کر دی۔ اتفاق سے یہ بوڑھا اس جہاز پر اپنے بیٹے کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے چڑھا تھا جو بحری ڈاکوؤں کا جہاز تھا اور جس میں فریانہ سوار تھی۔ بڈھے نے دریاکس کو بتایا کہ حال ہی میں ایک بحری قزاقوں کا جہاز وہاں آیا تھا۔ اس جہاز میں اس نے ایک سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی حسین لڑکی کو دیکھا تھا۔ مگر وہ ڈاکوؤں کے سردار کی قید میں تھی۔

دریاکس سر پکڑ کر رہ گیا۔ اس نے بوڑھے کو بتایا کہ وہی اس کی محبوبہ اور وہی اس کی منگیتر ہے۔ بوڑھے نے اُسے کہا۔

"میرے بچے! اب کیا ہو سکتا ہے۔ وہ جہاز تو یہاں سے چلا گیا اب تو وہ جہاز چھ ماہ کے بعد یہاں آئے گا اور کوئی خبر نہیں کہ اُسے سال ہی لگ جائے۔"

دریاکس خاموش رہا۔ اس کے سر پہ غم کا جہاز ٹوٹ پڑا تھا۔ اس نے اس جزیرے میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر بہت جلد اس پر اس حقیقت کا بھی انکشاف ہو گیا کہ وہاں کوئی نوجوان زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ وہاں کی عورتیں یہ گوارا نہیں کرتیں کہ اُن کے نوجوان بیٹے تو بحری قزاقوں کے جہازوں پر سوار سمندروں میں آوارہ گردی کرتے پھریں اور وہاں ایک نوجوان ان کی لڑکیوں کی نگاہوں کی آماجگاہ بنے۔ ظاہر ہے جزیرے کی لڑکیوں کا اکیلے نوجوان کی طرف متوجہ ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ وہاں کی بوڑھی عورتیں دریاکس کے خلاف ہو گئیں۔ دریاکس ایک سرائے میں رہتا تھا۔ ایک عورت نے جب دیکھا کہ اس کی نوجوان بیٹی روزانہ سرائے میں دریاکس سے ملنے جاتی ہے تو اس نے دریاکس کو زہر دینے کی کوشش کی مگر وہ بچ گیا۔

یہی حال دوسری نوجوان لڑکیوں کا تھا۔ انہوں نے بھی وہاں دریاکس کا جینا حرام کر دیا تھا۔ اب وہ خود وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک رات اس نے اسی بوڑھے سے مذاکرات کئے اور اس سے پوچھا کہ بحری ڈاکوؤں کا جہاز کن سمندروں میں سفر کرتا ہے اور یہ کہ اس کے خیال کے مطابق اب وہ کہاں ہوگا؟ بڈھے نے اُسے بتایا کہ بحری ڈاکوؤں کے جہاز کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ابھی وہ اس سمندر میں ہے تو ابھی کسی دوسرے سمندر میں قسمت آزمائی کر رہا ہوگا۔ دریاکس سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اُس نے بوڑھے سے مشورہ طلب کیا کہ اس جزیرے سے وہ کس طریقے سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ بوڑھے نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ ایک کشتی خریدے اور اس پر سفر کرے کیونکہ وہاں جہاز سوائے بحری قزاقوں کے اور کوئی نہیں آئے گا۔ دریاکس کے پاس ابھی اتنے پیسے تھے کہ وہ اپنی ایک کشتی خرید سکے۔ چنانچہ اُس نے ایک کشتی خرید کر اس میں پانی اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں رکھیں اور ایک دن صبح صبح اس جزیرے سے کوچ کر گیا۔

## ایک نئی داستان

بقول فیولس اب ایسا ہوا کہ بحری ڈاکوؤں کے جہاز کو سمندر میں زبردست طوفان نے آلیا۔ طوفان سمندروں میں آیا ہی کرتے ہیں مگر یہ کوئی بڑا ہی بھیانک طوفان تھا بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ جہاز ایک لکڑی کے کھلونے کی طرح بپھری ہوئی موجوں پر اُچھل رہا تھا۔ جہاز کے سارے بادبان لپیٹ دیئے گئے۔ پھر بھی جہاز کے ہچکولوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ حالت یہ ہو گئی کہ سردار کے حکم سے خطرے کی گھنٹی بجا دی گئی۔ ڈاکوؤں نے سمندر میں ہنگامی کشتیاں اُتارنی شروع کر دیں۔ فریانہ کو بھی قید کی کوٹھڑی سے باہر نکالا گیا۔ پریشانی سے اُس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ ابھی کشتیاں سمندر میں اتری بھی نہیں تھیں کہ سمندر کی ایک ہیبتناک موج اُٹھی اور اس نے جہاز کو اُلٹ دیا۔ جہاز میں پانی بھر گیا اور وہ ڈوبنے لگا۔ اب کچھ کشتیوں میں

اب کیسے کشتیوں میں سوار ہونے کی ہوش تھی اور پھر خدا جانے کوئی زندہ بھی بچا تھا یا نہیں۔

جس وقت جہاز غرق ہوا فریانہ عرشے پر رسیوں کو مضبوطی سے پکڑے کھڑی تھی۔ جہاز کے اُلٹتے ہی اُسے ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ اُڑ کر سمندر میں جا گری۔ وہ غوطے کھا رہی تھی کہ ایک چھوٹی سی کشتی اس کے قریب سے گذری۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس پر سوار ہو گئی۔ وہ کشتی میں گرتے ہی نقاہت اور غم سے بے ہوش ہو گئی۔ اُسے کوئی ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے اور کہاں جا رہی ہے۔ دوسرے ڈاکوؤں کا بھی بھیانک انجام ہوا۔ ایک ایک کر کے وہ سارے کے سارے سمندر میں جہاز کے ساتھ ہی غرق ہو گئے۔ طوفان ساری رات جاری رہا۔ دن نکلا تو سمندر پُرسکون ہوا۔ فریانہ کی کشتی سمندر میں چلی جا رہی تھی۔ دھوپ نکلی تو اُسے ہوش آیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک کشتی میں اکیلی پڑی ہے اور کشتی سمندر کی لہروں پر کسی نامعلوم منزل کی طرف بہی چلی جا رہی ہے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے دیوتاؤں کے حضور جھک کر دُعا مانگی کہ اُسے بخیر و عافیت خشکی پر پہنچا دیا جائے۔ سارا دن وہ سمندر میں سفر کرتی رہی۔ بھوک اور پیاس سے اُس کا بُرا حال ہو گیا۔ سمندر کا پانی اس قدر کڑوا تھا کہ وہ اس کا ایک گھونٹ بھی نہ نگل سکی۔ رات آگئی۔ سردی بڑھ گئی۔ وہ کشتی میں ایک کونے میں لگ کر پڑ رہی۔ سمندر سے اُسے خوف بھی آنے لگا تھا۔ ساری رات کشتی سمندر میں بہتی رہی۔ کبھی وقت اُسے نیند آجاتی۔ کسی وقت وہ ڈر کر اُٹھ جاتی۔ اسی طرح رات گذر گئی۔ سورج کی پہلی کرن نکلی تو اس نے جنوب کی طرف دیکھا۔ سامنے کسی جزیرے کا ساحل اور ساحل کے اونچے لمبے درخت نظر آرہے تھے۔ خوشی سے فریانہ کے جھوکے پیاسے چہرے پر رونق آگئی۔ کشتی بڑی تیزی سے اپنے آپ اس جزیرے کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی۔ جزیرے کا ساحل کچھ دیر گذرنے پر صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ درخت ناریل اور تاڑ کے تھے۔ درختوں میں بے شمار ناریل لگے تھے۔ وہ ان ناریلوں سے اپنی پیاس بجھا سکتی تھی۔ پیاس سے اُس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ ایک بات دیکھ کر وہ تعجب کر رہی تھی کہ اگرچہ سمندر کا ساحل اُسے دُور تک دکھائی دے رہا تھا مگر وہاں کوئی انسان دُور دُور تک نظر نہیں آرہا تھا۔ آخر کشتی کنارے پر جا کر رُک گئی۔ فریانہ کشتی میں سے اُتر کر گھٹنے گھٹنے پانی میں سے گذرتی جزیرے پر آگئی۔ جزیرے کی ریت زرد اور سُرخ رنگ کی تھی اور ذرا پرے کتنے ہی ناریل بکھرے پڑے تھے۔ فریانہ نے قریب جا کر ایک ناریل اٹھایا اُسے پتھر پر مار کر توڑا اور اس کا میٹھا پانی پی گئی۔ ناریل کے پانی نے اس کے تنِ مردہ میں جان ڈال دی۔ وہ ریت پر لیٹ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگی کہ اگر اس جزیرے پر آدم خور لوگ آباد ہوئے تو اس کا انجام ظاہر ہے۔ پھر اُسے دنیا کا کوئی انسان ان آدم خوروں سے نہ بچا سکے گا۔ آدم خوروں کے خیال سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔

ذرا فاصلے پر درختوں کا گھنا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ درختوں کے پاس آکر رُک گئی۔ جنگل میں ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ دھوپ کی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر گھاس پر پڑ رہی تھیں۔ کسی وقت ڈال پر بیٹھا کوئی پرندہ بول جاتا تھا۔ فریانہ حیران تھی کہ اتنا زرخیز اور پھلدار درختوں سے بھرا ہوا جزیرہ بے آباد نہیں ہو سکتا۔ اس نے جنگل میں آگے چلنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے وہ ایک جگہ رُک گئی۔ اس نے گھنی جھاڑیوں کے چوڑے پتوں کو ہٹا کر دیکھا تو سامنے کھلی جگہ پر کچھ گھاس پھونس کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس جزیرے پر آدم خوروں کا ایک خونخوار قبیلہ آباد تھا۔ یہ جھونپڑیاں انہی آدم خوروں کی تھیں۔ فریانہ کو کچھ معلوم نہ تھا۔ جھونپڑی میں سے ایک بوڑھی عورت باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی۔ ٹوکری میں پتے تھے۔ پتے اس نے باہر اُلٹ دیئے، اور واپس جھونپڑی میں چلی گئی۔ بھوک سے فریانہ کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ ابھی وہ اس عورت کے پاس جانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک کسی نے پیچھے سے اُس کے بازو پکڑ لئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سیاہ فام ننگ دھڑنگ وحشی اس کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ فریانہ کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ اُسے ہوش آیا تو وہ ایک گھاس پھونس کی بنی ہوئی جھونپڑی میں زمین پر لیٹی تھی اور ایک عورت اس کے پاس بیٹھی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ فریانہ کو ہوش میں آتا دیکھ کر وہ اٹھی باہر گئی اور اس کے لئے اُبلی ہوئی شکر قندی اور آلو لے کر آگئی۔ فریانہ نے اس سے کچھ پوچھے اور بات کئے بنا شکر قندی آلو کھائے۔ مٹی کے پیالے میں پانی پیا اور پھر عورت سے اپنی زبان میں پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ عورت اس کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کو کہا اور پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ایک ہٹا کٹا سیاہ فام حبشی اندر آگیا جس کے جسم پر سوائے ایک گھاس کے لنگوٹ کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ فریانہ کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ فریانہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور پرے ہٹ گئی۔ حبشی قہقہہ مار کر ہنسا اور پھر باہر نکل گیا۔

### داستان کا سفر

فریانہ سمجھ گئی کہ اس وحشی قبیلے والوں نے اُسے قید کر لیا ہے۔ اُسے یہ خبر نہیں تھی کہ یہ قبیلہ آدم خوروں کا ہے اور انھوں نے اُسے پورے چاند کی رات کو اپنی دیوی پر قربان کرنے کے لئے منتخب کر لیا ہے۔ یہ انکشاف اُس پر اُس وقت ہوا جب ایک بوڑھی عورت اُس کے سر میں ڈالنے کے لئے ناریل کا تیل لے کر اندر آئی۔ یہ بوڑھی عورت پُرانی زبانیں جانتی تھی۔ فریانہ نے اس سے پوچھا کہ اُسے کیوں قید کر لیا گیا ہے؟ اس عورت نے فریانہ کے سر پہ ہاتھ پھیر کر بتایا کہ وہ خوش قسمت عورت ہے کہ اُسے قبیلے والوں نے اپنی دیوی پر قربان کرنے کے لئے چن لیا ہے۔ فریانہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ اُٹھ کر باہر جانے لگی تھی کہ باہر سے ایک دیوزاد حبشی نے اُسے دھکا دے کر اندر گرا دیا۔ فریانہ زمین پر گرتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ ساری رات وہ بے ہوش پڑی رہی۔ پچھلے پہر اُسے ہوش میں لایا گیا۔ اب اُس کی خدمت ہونے لگی۔ اُسے بہترین غذا کھانے کو دی جاتی۔ اُس کی ہر آسائش کا خیال رکھا جاتا۔ لیکن اُسے جھونپڑی سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ صبح شام دو حبشی آدم خور اُسے اپنی نگرانی میں جنگل میں تھوڑی سی سیر کراتے اور پھر واپس لا کر اُسی جھونپڑی میں بند کر دیتے۔ فریانہ کے لئے وہاں سے فرار ہونے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ اپنی قسمت اور نصیبوں کے لکھے پر صبر شکر کر کے بیٹھ گئی ہے۔

### بیان کا جادو

فیوبس اس کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے واپس بحیرہ روم کے سمندر کی طرف آتا ہے جہاں اُس کی داستان کا ہیرو اور فریانہ کا منگیتر دریاکس تنہا کشتی میں اپنی محبوبہ کی تلاش میں سفر کر رہا ہے۔ سمندر میں اس کی کشتی کو بہتے چار دن ہو گئے ہیں۔ سمندر کی لہریں پُرسکون تھیں۔ دھوپ اور سورج کی حدت نے دریاکس کی جلد کو گہرا سانولا کر دیا تھا۔ اُس کے دل میں بس ایک ہی لگن تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی محبوبہ کے پاس پہنچ جائے۔ یہی لگن اُسے مصیبتوں اور ناگہانی بلاؤں کا مقابلہ کراتے اپنی منزل کی طرف لئے چلی جا رہی تھی۔ ایک رات وہ کشتی میں سویا ہوا تھا کہ اس کے ماتھے پر بارش کی بوندیں گریں۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آسمان پر ستارے غائب تھے اور ہر طرف گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بجلی رہ رہ کر چمکنے لگی تھی۔ شاید سمندر میں ایک بار پھر طوفان آرہا تھا۔ اس نے جلدی سے کھانے پینے کی چیزوں کو محفوظ جگہ پر رکھ دیا۔ ہوا تیز ہو گئی اور کشتی نے ڈولنا شروع کر دیا۔ دریاکس نے اپنے آپ کو سمندری طوفان کے لئے تیار کر لیا تھا۔ وہ اب طوفان کا عادی ہو گیا تھا۔ یہ کشتی ویسے بھی کھلی تھی اور اس کے ڈوبنے کا بہت کم امکان تھا۔ پھر بھی وہ دل میں دیوتاؤں سے یہی دُعا مانگ رہا تھا کہ طوفان بخیر و عافیت سے گذر جائے مگر یہ طوفان آسانی سے گذر جانے والا طوفان نہیں تھا۔ بادل گرجنا شروع ہو گئے

اور اس کے ساتھ ہی بارش برسنے لگی۔ ہوائیں بھی شور مچانے لگیں اور سمندر کی لہروں میں تموج پیدا ہوگیا۔

اندھیری رات میں بجلی چمکتی تو دریاکس کو دُور دُور سے پہاڑ ایسی موجیں، ٹھاٹھ کر اس کی طرف آتی دکھائی دیتیں۔ کشتی بُری طرح ڈگمگا رہی تھی۔ دریاکس کشتی کے پیندے لگ کر لیٹا ہوا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کشتی بے حد تیز رفتاری کے ساتھ کسی خاص سمت کو بہی چلی جا رہی ہے۔ ساری رات طوفان برپا رہا اور اس کی کشتی تیزی سے بہتی رہی۔ رات کے پچھلے پہر طوفان میں کچھ کمی ہوئی بارش رُک گئی۔ ہوا بھی سُست پڑ گئی اور سمندر کی لہریں اپنے معمول پر آنا شروع ہوگئیں۔ دریاکس نے خدا کا شکر ادا کیا اور کشتی میں لیٹ گیا۔ آسمان پر کہیں کہیں تارے نکل آئے تھے۔ رات کا جادو ٹوٹنا شروع ہوگیا تھا۔ رات بھر کی تھکن اور بیداری کی وجہ سے دریاکس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اُسے ذرا سکون اور آرام نصیب ہوا تو نیند آگئی اور وہ سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ گھبرا کر کشتی میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اسکی کشتی دو بہت بڑی بڑی بنجر چٹانوں کے درمیان میں سے گزر رہی تھی۔ گویا وہ کسی جزیرے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا کہ ایک طویل تکلیف دہ سمندری سفر کے بعد اس کو زمین کی شکل دکھائی دی۔ لیکن یہ خوشی بڑی ہی عارضی ثابت ہوئی۔ وہ ایک چٹان سے گھوم کر باہر کھاڑی میں آیا تو اُسے ایک بھیانک آواز سنائی دی۔ یہ آواز بے حد بھیانک اور زوردار تھی۔ جیسے چٹانوں پر سے بڑے بڑے پتھر نیچے لڑھک رہے ہوں۔ ناگاہ اس کی نظر چٹان کے اوپر گئی تو اس کا سانس اوپر کا اوپر رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ چٹان کے اوپر ایک بہت ہی قوی الجثہ دیو قامت آدمی کھڑا ہے جس کا قد ایک درخت ایسا ہے اور سر کے اوپر سینگ نکلا ہے۔

## کہانی کا شاہ جنات

دریاکس نے اُن جنوں اور دیوتاؤں کے بارے میں سن رکھا تھا جو سمندروں کے دور دراز ویران جزیروں میں رہتے ہیں اور اکے دکے انسان کو پاکر اُسے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ وہ بہت گھبرا گیا۔ اس نے چپو چلا کر کشتی کو واپس سمندر کی طرف موڑنے کی کوشش شروع کردی۔ اتنے میں اس دیو کو بھی احساس ہوگیا کہ اس کا شکار فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے ایک بہت بڑا پتھر دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور پوری قوت سے اُسے سمندر کی کھاڑی میں ٹھیک اس مقام پر پھینک دیا جہاں دریاکس کی کشتی جا رہی تھی۔ دریاکس نے چٹان کے ایک بہت بڑے ٹکڑے کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس نے کشتی میں سے سمندر میں چھلانگ لگادی۔ اگر وہ ایک پل کی بھی دیر کر دیتا تو کشتی کے ساتھ اس کا بھی بھُرکس نکل جاتا۔ چٹان کا ٹکڑا عین کشتی کے اوپر آکر گرا اور کشتی کے پُرزے اڑ گئے۔ دریاکس نے پانی میں ڈبکی لگائی اور اندر ہی اندر تیرتا ہوا سامنے والی چٹان کے کنارے پر جا کر نکل گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے واپس نگاہ ڈالی تو چٹان کے اوپر وہ سینگ والا دیو کہیں نہیں تھا۔ شاید وہ اس کی تلاش میں ادھر ہی آ رہا تھا۔ دریاکس اُسکے آنے سے پہلے پہلے کسی محفوظ جگہ اپنے آپ کو چھپا دینا چاہتا تھا۔ وہ پتھروں پر بھاگتا چلا گیا۔ اس جزیرے پر درخت کہیں نام کو بھی نہیں تھا ہر طرف کنتھئی رنگ کی جھاڑیاں ہی جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں یا بھربھری چٹانوں کا سلسلہ تھا جو حد نظر تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ یہاں چھپنے کو کوئی بھی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ دریاکس جانتا تھا کہ وہ جن اُس کی تلاش میں ادھر آنے ہی والا ہوگا۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے پھر کہیں بھیانک آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں اگرچہ دُور سے آ رہی تھیں مگر ان میں بلا کی ہیبت اور خوف تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سینگ والا جن بڑے بڑے پتھروں کو توڑتا پھوڑتا، غراتا اس کی طرف چلا آرہا ہے۔ اب تو دریاکس بے چارے کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس وقت اُسے نیچے کھاڑی کے پانی کی سطح سے اونچے ایک غار کا دہانہ دکھائی دیا۔ دریاکس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ وہیں سے کھاڑی میں چھلانگ لگادی اور تیرتا ہوا اس غار کے دہانے پہ پہنچ گیا۔ یہاں چٹانوں میں ابھرے ہوئے پتھروں پر پاؤں رکھتا وہ غار کے اندر داخل ہوگیا۔ یہ ایک اندھیرا اور ٹھنڈا غار تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی کچھ پرندے ڈر کر پھڑپھڑاتے ہوئے باہر کو اڑ گئے۔ یہ ایک نشانی ہو سکتی تھی جن کو یہ بتانے کی کہ اس کا شکار غار میں چھپا ہوا ہے دریاکس نے سانس کھینچ لیا اور ہمہ تن گوش ہو کر باہر دیکھا۔ کھاڑی کا پانی پُرسکون تھا۔ چٹانوں پہ بھی کہیں کسی جگہ وہ خونناک سینگ والا جن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ مطمئن ہوگیا کہ پھڑپھڑا کر اڑنے والے پرندوں نے اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

مگر وہ پوری طرح چوکنا تھا اور ایک پل کے لئے بھی غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ سب سے بڑی تشویش کی بات یہ تھی کہ باہر سے آوازیں آنا بند ہوگئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یا تو دیو اس کے قریب پہنچ کر رک گیا ہے اور یا پھر واپس چلا گیا ہے۔ واپس جانے کا سوال اس لئے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ دریاکس اس کے قبضے میں آسانی سے آسکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے جن اس کا تعاقب کرتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ ضرور وہ کسی جگہ رک گیا ہے اور دریاکس کی ایک ایک حرکت کا مطالعہ کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس کے وہم ہوں۔ لیکن داستان گو بیان کرتا ہے کہ یونانی نوجوان مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں بس ایک ہی خیال اور اس کے سر پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ چاہے اُسے بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑے وہ اپنی محبوبہ فریانہ سے مل کر ہی رہے گا۔ اُسے تلاش کرکے رہے گا۔ جزیرے پر گہری خاموشی طاری تھی۔ دور کسی جگہ سمندر کے اوپر پرندے اڑتے ہوئے بول رہے تھے۔ وہ دیر تک غار کے اندر دم سادھے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے یوں محسوس کیا جیسے سمندر میں پانی کی لہریں بڑے زور سے اِدھر اُدھر چھلک رہی ہوں۔ یہ کس کی آواز ہو سکتی تھی! کیا کوئی بڑی کشتی یا جہاز اس طرف کھاڑی میں آگیا تھا؟ دریاکس نے غار کے دہانے پر آکر باہر جھانکا۔ جونہی اس نے باہر جھانکا اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہی سینگ والا دیو کھاڑی میں سینے تک ڈوبا زور زور سے پانی کو اپنے لمبے لمبے ہاتھوں سے ہٹاتا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو دونوں کے منہ سے بیک چیخ نکل گئی۔ دریاکس کی چیخ میں دہشت تھی۔ دیو کی چیخ میں خوشی کا نعرہ تھا۔ دیو اس کے غار کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ کم بخت بجلی ایسی تیزی کے ساتھ پانی کی بڑی بڑی موجوں کو ادھر اُدھر ہٹاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ غار اندر سے بند تھا۔ اگر وہ پانی میں چھلانگ لگاتا ہے تو دیو اسے ضرور قابو کرے گا۔ اب کیا کیا جائے؟ دریاکس کو اپنی موت سامنے کھڑی نظر آنے لگی۔ دیو چیختا چلاتا بھیانک انداز میں آوازیں نکالتا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ دریاکس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ آخر اس نے سمندر میں چھلانگ لگادی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح تیر کر کھاڑی میں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ جونہی اس نے کھاڑی کے پانی میں چھلانگ لگائی وہ دیو اس کی طرف قہقہہ لگا کر پھنکارتا ہوا بڑھا۔ دریاکس نے پوری تیزی سے آگے نکلنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دیو بڑے بڑے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس کے سر کے اوپر پہنچ گیا تھا۔ اور پھر اس نے اپنے سر کے اوپر ایک بہت بڑا ہاتھ آتا دیکھا۔ یہ ہاتھ اس دیو کا تھا۔ دیو نے دریاکس کو پانی میں ہی دبوچ لیا اور بھیگے ہوئے مینڈک کی طرح اٹھا کر اپنی مٹھی میں لے لیا۔

## یولی سیس کی بازگشت

یہاں ہمیں یولی سیس کی روایت کی ایک بھرپور جھلک ملتی ہے اس قدیم ترین اور دلچسپ ترین یونانی لوک داستان میں ہمیں وہی جن ملتا ہے جو یولی سیس کی روایت میں ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس دیو کی دونوں آنکھیں موجود ہیں جب کہ یولی سیس والے جن کے ماتھے پر صرف ایک آنکھ تھی۔ یہاں سے فیولس کی داستان بھی یولی سیس کی کہانی کے بہت قریب سے ہو کر گذرتی ہے۔ آگے کہانی یوں چلتی ہے اور فیولس اُسے یوں بیان کرتا ہے کہ دیو نے دریاکُس کو اپنے قابو میں کر لیا اور اسے لے کر اس بنجر جزیرے کی سب سے اونچی چٹان کے اوپر ایک بہت بڑے غار میں آ گیا۔ اس غار کی چھت بہت اونچی تھی۔ لیکن اس دیو کو اس میں بھی جھک کر چلنا پڑتا تھا۔ دیو نے دریاکُس کو ایک جگہ بہت بڑے پتھر اٹھا کر اس کے اندر رکھ دیا اور اوپر پتھر کی چھت ڈال دی گئی۔ ایک اعتبار سے دریاکُس کسی چوہے کی طرح اپنے بل میں بند کر دیا گیا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے آس پاس اندھیرا ہے۔ ٹھنڈے پتھر کی درزوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی ہے۔ اس نے درز کے ساتھ اپنا منہ لگا دیا اور ایک بے بس چوہے کی طرح باہر کو دیکھنے لگا۔ باہر غار کے پتھریلے فرش پر وہی سینگ والا دیو آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے آگ جل رہی تھی اور وہ آگ میں کسی شے کو ڈال کر گرم کر کے کھا رہا تھا۔ دریاکُس یہ دیکھ کر دہشت سے کانپ اٹھا کہ اُس دیو کے ایک ہاتھ میں بہت بڑا اژدہا اور دوسرے ہاتھ میں ایک مگرمچھ تھا۔ اژدہا کی اُس نے گردن دبوچ رکھی تھی۔ وہ اس کی ستون ستون ایسی انگلیوں میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ یہی حال مگرمچھ کا تھا جس کی گردن دیو نے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں دبوچ رکھی تھی۔

دریاکُس کے دیکھتے دیکھتے دیو نے اژدہے کی گردن آگ میں ڈال دی۔ فضا میں ایک بھیانک پھنکار بلند ہوئی اور آگ کے انگارے اڑ کر چھت تک گئے۔ دیو نے ایک مہیب قہقہہ لگایا اور دوسرے لمحے سیاہ جلے ہوئے اژدہے کو اپنے حلق میں ڈال لیا اور زور زور سے چبانے لگا۔ پھر اس نے مگرمچھ کو آگ میں ڈال دیا اور اُسے یوں بھوننے لگا جیسے کباب بھون رہا ہو۔ آگ میں پڑتے ہی مگرمچھ بُری طرح سے تڑپا۔ اس کی دُم نے ایک زبردست خم کھایا اور وہ تڑاک سے دیو کے کولھے پر لگی۔ لیکن دیو پر اس ضرب کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بڑے مزے سے آلتی پالتی مارے بیٹھا اژدہے کو نگلتا رہا۔ اژدہے کو ہڑپ کرنے کے بعد دیو نے آگ میں سے مگرمچھ کو بھی نکال لیا جو جل کر بالکل سیاہ پڑ گیا تھا اور اس میں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی باقی نہیں رہی تھی۔ دیو کے ہاتھ میں وہ سیاہ مگرمچھ ایک بھنے ہوئے کریلے کی طرح پکڑا ہوا تھا۔ دیو نے منہ کھول کر آدھے مگرمچھ کو دانتوں سے کاٹ کر ہڑپ کیا۔ دوسری بار باقی آدھے مگرمچھ کو منہ کے اندر ڈال لیا۔

دریاکس یہ خوفناک رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ خوف سے اُس کے جسم کے سارے بال کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ سوچ کر اس کا بُرا حال ہو رہا تھا کہ یہ دیو اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرے گا۔ ظاہر ہے کہ دیو نے دریاکُس کو وہاں طوطے کی طرح پالنے کے لئے نہیں رکھا تھا۔ اژدہے اور مگرمچھ کو ہضم کرنے کے بعد دیو نے اتنی زور سے ڈکار مارا کہ یوں لگا جیسے غار کے باہر بڑے زور سے بادل گرجا ہو۔ دریاکس نے اپنے چوہے ایسے بل میں کھڑے کھڑے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ دیو نے آگ کے پاس ہی اپنی لمبی لمبی ٹانگیں پسار دیں، اپنا سر پیچھے غار کی دیوار کے ساتھ لگایا اور سو گیا۔ اس کے خراٹوں کی آواز سے پورا غار گونج رہا تھا۔ اور یوں لگ رہا تھا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ اب وقت تھا کہ دریاکس نے وہاں سے فرار ہونے کی تدابیر پر غور کرنا شروع کر دیا۔ اس کا دماغ بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا کہ وہ کس طریقے سے وہاں سے بھاگ جائے۔ اس نے دونوں ہاتھ لگا کر اپنے چھوٹے سے بل یا غار کے اوپر رکھے ہوئے پتھر کو ہٹانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ پتھر اس قدر بھاری اور وزنی تھا کہ ہلانا تو کجا اُسے اپنی جگہ سے سرکانا کا بھی دارد نہ تھا اس پتھر کو تو دس ہاتھی مل کر ہی اپنی جگہ سے ہلا سکتے تھے اس طرف سے نا امید ہو کر دریاکس نے غار کے سوراخ میں سے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر سوراخ اس قدر تنگ تھا کہ اس کا صرف سر ہی باہر نکل سکا۔ پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور سوراخ کو فراخ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اگر وہاں مٹی ہوتی تو شاید وہ سوراخ چوڑا کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ چٹان چھوٹے چھوٹے سخت پتھروں سے مل کر بنی تھی اور اس کی زمین اتنی سخت تھی کہ دریاکس کے ناخن چھل گئے لیکن وہ ایک انچ بھی کسی پتھر کو اپنی جگہ سے ہلانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب وہ ضرور سینگ والے دیو کی خوراک بن جائے گا۔ رات آ گئی اور اس نے تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو اس شیطان صفت دیو کے پنجے میں دیکھا کہ وہ اسے ایک معمولی پیاز کے ٹکڑے کی طرح آگ میں ڈال کر کھا رہا ہے۔ دریاکس کانپ گیا۔ وہ کسی حالت میں بھی فریانہ سے ملنے سے پہلے مر نہیں سکتا تھا۔ اس نے دل میں پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ اُسے اس وقت تک موت نہیں آ سکتی جب تک کہ وہ اپنی پیاری محبوبہ کو نہ مل لے۔ اس عزم اور اس قوت ارادی نے دریاکُس کی شخصیت میں ایک زبردست خود اعتمادی اور ہر حالت میں زندہ رہنے اور زندگی کے لئے جدوجہد کرنے کا ناقابل شکست جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے اُسے بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی زندہ و بیدار رکھا تھا اور وہ مہیب سمندری طوفانوں سے ٹکرا گیا تھا اُسے یقین تھا کہ وہ اب بھی اس مصیبت سے زندہ بچ کر نکل جائے گا۔ اس لئے وہ وہاں سے فرار ہونے کی مسلسل جدوجہد کرتا رہا۔ سینگ والا دیو سو رہا تھا اور اس کے خراٹوں سے غار کی زمین ہل رہی تھی۔ یہ بڑا نادر موقع تھا۔ اگر اسی وقت کسی طریقے سے دریاکس اپنی غار میں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ وہاں سے بڑی آسانی سے فرار ہو سکتا تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ غار کی زمین بڑی سخت تھی۔

## دیومالائی بنجرہ

اس کے باوجود دریاکُس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ غار کے دہانے پر سے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو اکھاڑنے کی مسلسل کوشش کرتا رہا۔ آخر اس کی محنت اور جدوجہد رنگ لائی۔ سوراخ کے دہانے پر سے ایک پتھر اپنی جگہ سے ہل کر اکھڑ گیا۔ اس ایک پتھر نے اکھڑ کر دوسرے پتھر کی بنیاد کو ہلا دیا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد دریاکُس نے دوسرے پتھر کو بھی اکھاڑ ڈالا۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک کے بعد ایک چھوٹے چھوٹے پتھر اکھڑتے چلے گئے اور سوراخ کا دہانہ فراخ ہونے لگا۔ کافی دیر کے بعد دریاکُس غار کے دہانے کو اتنا فراخ کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اس میں سے پھنس کر باہر نکل سکتا تھا۔ اس نے ایک پل بھی ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور لیٹ کر رینگ رینگ کر باہر نکلنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس کا آدھا دھڑ غار کے سوراخ سے باہر آ گیا۔ اچانک دیو نے پہلو بدلا۔ اس کے خراٹے ایک پل کے لئے رُکے۔ دریاکس نے اپنا سانس روک لیا۔ اگر اُس وقت دیو کی نگاہ اس پر پڑ جاتی تو وہ اُسے بڑی آسانی سے ایک کچھوے کی طرح باہر کھینچ کر آگ میں بھون کر ہڑپ کر سکتا تھا۔ لیکن دیو پہلو بدل کر سو گیا اور اُس کے خراٹوں کی آواز ایک بار پھر گونجنے لگی۔ دریاکس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دیو دوسری طرف منہ کئے سو رہا تھا۔ یہ بڑا سنہری موقع تھا۔ اس نے رینگ رینگ کر باہر نکلنے کی کوشش تیز تر کر دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنے

بل سے باہر نکل آیا تھا۔ اب سب سے بڑا اور کٹھن مرحلہ بڑے غار کے دہانے میں سے باہر نکلنے کا تھا۔ مصیبت یہ بن گئی تھی کہ غار کے منہ کے آگے دیو کی پوری ایک لات آگئی تھی۔ یہ لات غار کے دروازے میں کسی بہت بڑے تناور درخت کی طرح پڑی تھی۔ اس کو چھوئے بغیر وہاں سے نکلنا ایک بڑی ہی خطرناک اور ناقابلِ یقین بات تھی۔ مگر دریاکس نے دل میں ارادہ کر رکھا تھا کہ وہاں سے ضرور فرار ہوگا۔

چنانچہ اس نے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے غار کی ڈیوڑھی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ آگ اسی طرح جل رہی تھی۔ دیو گہری نیند میں تھا۔ اس کے خراٹوں سے غار اسی طرح گونج رہی تھی۔ دریاکس غار کی دیوار کے ساتھ لگا ایک ایک قدم آگے بڑھاتا ڈیوڑھی کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اب وہ ڈیوڑھی کی دہلیز پر پہنچ گیا تھا۔ وہ ایک پل کے لئے رُک گیا۔ اس نے ڈیوڑھی کے اندر پڑی ہوئی دیو کی بہت بڑی ٹانگ کو دیکھا۔ اس ٹانگ نے ساری ڈیوڑھی کو ڈھانپ رکھا تھا اور غار کے دہانے سے باہر تک چلی گئی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ آزاد ہونے کی یہی ایک صورت تھی کہ کسی طرح سے دیوار کے ساتھ ساتھ اس طرح راستہ طے کیا جائے کہ پاؤں جن کی ٹانگ سے نہ ٹکرانے پائیں۔

یہ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ ڈیوڑھی بھی کافی لمبی تھی۔ باہر سے روشنی اندر تک آ رہی تھی۔ یہ روشنی دریاکس کو کافی حد تک مدد دے رہی تھی۔ اُس نے دیوتاؤں کو یاد کیا اور ڈیوڑھی کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ وہ بالکل جوں کی چال چل رہا تھا اور پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں اس کا پاؤں دیو کی ٹانگ سے نہ ٹکرا جائے۔ اُس نے کمال کیا کہ وہ آدھی ڈیوڑھی عبور کر گیا۔ یہاں وہ دیو کی ٹانگ کے گھٹنے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ دریاکس اس جدوجہد سے بے حد تھک گیا تھا۔ وہ رُک گیا۔ اس نے اپنا سر دیوار کے ساتھ لگا دیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

جب اس کا سانس بحال ہوا تو وہ دیوار کے ساتھ لگا لگا کھسکتا ہوا غار کے دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن بدنصیبی وہاں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ وہاں ایک پتھر پڑا تھا جو اندھیرے میں دریاکس کو نظر نہ آیا۔ اس کا پاؤں اس پتھر کے ساتھ ٹکرایا اور وہ دھم سے دیو کی ٹانگ کے اوپر جا گرا۔ دیو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے گردن اٹھا کر جو دیکھا کہ اس کا شکار باہر کو بھاگ رہا ہے تو اس کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی ٹانگ اوپر اٹھا کر دریاکس کو جہاں وہ تھا اسی جگہ دبا لیا۔ پھر اس بل کی طرف دیکھا جو پتھر کے نیچے تھا اور جس کے سوراخ کو کھلا کر کے وہ وہاں سے نکل آیا تھا۔ پھر دیو نے دریاکس کو ہاتھ کی مٹھی میں لے لیا اور اسے واپس اسی بل میں ڈال کر اوپر نیا پتھر اس طرح رکھ دیا کہ اندر بڑی معمولی سی روشنی جاتی تھی۔
دریاکس کے لئے یہ ایک نیا جنم تھا۔ وہ زمین پر ایک نیم مردہ چوہے کی طرح اوندھے منہ پڑا تھا۔ دیو نے اُسے مٹھی میں کچھ اس طرح سے قابو کیا تھا کہ اس کا انگ انگ درد کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دیو نے پتھر اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ دریاکس سمجھ گیا کہ اب دیو اس کا ناشتہ بنانے کے لئے آیا ہے۔ لیکن ابھی اس کی آخری گھڑی نہیں آئی تھی دیو نے چھت کے ساتھ کسی کونے کھدرے سے لٹکے ہوئے پنجرے کو اتار کر زمین پر رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور دریاکس کو اٹھا کر اُس کے اندر قید کر کے دروازہ بند کر لیا۔ اور ہنس ہنس کر پنجرے کو گھما گھما کر دریاکس کو اس کے اندر قید دیکھنے لگا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

## جن کے پنجے سے رہائی

دریاکس بے بسی کی صورت بنا پنجرے کے اندر بیٹھا تھا پنجرے کی سلاخیں بڑی مضبوط لکڑی کی تھیں اور ایک ایک سلاخ درخت کے تنے کے برابر تھی اور ایک دوسری کو کاٹ کر گذر گئی تھی۔ یوں کہ ان میں سے گذرنے کو تھوڑی سی جگہ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ یہ پنجرہ بس اتنا ہی اونچا تھا کہ دریاکس اس میں کھڑے ہو کر دو قدم آگے پیچھے ٹہل سکتا تھا۔ دیو نے پنجرے کو غار کی چھت کے ساتھ لٹکا دیا۔ یہ منظر بلاشبہ خوفناک تھا کیونکہ اگر پنجرہ وہاں سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑے تو وہ یقیناً پنجرے کے ساتھ ہی ٹوٹ پھوٹ کر چکنا چور ہو جائے۔ دیو اسے چھت کے ساتھ ہی لٹکتا چھوڑ کر غار سے باہر نکل گیا۔ دریاکس کو بڑا افسوس ہوا کیونکہ اگر وہ ذرا صبر کرتا تو دیو کو اٹھ کر باہر جانا ہی تھا۔ ایسی صورت میں فرار ہونے کا بڑا سنہری موقع تھا۔ اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب اسے نئے سرے سے اپنے فرار کے بارے میں سوچنا تھا۔ لیکن وہ اس دفعہ ایسے بُرے طریقے سے قید ہوا تھا کہ رہائی بظاہر ناممکن نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دیو پھر غار کے اندر آیا اور دریاکس کے پنجرے میں پانی کی بالٹی اور کچھ پھل رکھ کر چلا گیا۔ دریاکس نے پھل کھائے پانی پیا اور اپنی رہائی کے بارے میں غور کرنے لگا۔ وہ اس موضوع پر جتنا سوچتا اتنا ہی اس کا ذہن پریشان ہو جاتا۔ اُسے کوئی تدبیر نظر نہیں آ رہی تھی۔ پنجرہ زمین سے کافی اونچا تھا۔ بڑے بڑے درختوں کے تنوں کو رسیوں سے جوڑ کر بڑی مضبوطی سے باندھا گیا تھا۔ اس نے رسیوں کو ہلانے جلانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ دیو نے اپنی پوری طاقت سے گانٹھیں لگائی تھیں۔ دریاکس نے اپنے آپ کو کچھ دیر کے لئے تقدیر کے حوالے کر دیا اور پنجرے میں پڑے تختے پر لیٹ گیا۔ رات کا اندھیرا غار میں پھیلنے لگا۔ دیو ابھی تک باہر ہی تھا۔ پھر رات گہری ہو گئی۔ دریاکس کو نیند آنے لگی اور وہ سو گیا۔

اچانک دیو کے آنے کے شور سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ دیو ایک سیاہ فام انسان کو پکڑے چلا آ رہا ہے۔ انسان اُس کی مٹھی میں بند چیخ رہا ہے۔ چلا رہا ہے۔ دیو زور زور سے قہقہے لگا رہا ہے۔ آگ بجھ گئی تھی۔ دیو نے سیاہ فام انسان کو ایک طرف پاؤں کے نیچے دبا لیا اور آگ روشن کر دی۔ وہ پتھروں کو رگڑ کر ایک پل میں آگ جلا لیتا تھا۔ آگ جلا کر اُس نے سیاہ فام انسان کو ایک ہاتھ میں اوپر اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ سے زمین کے اندر ہاتھ ڈال کر پتھر کا ایک پتلا سا نیزہ نکالا۔ نیزے کو دیکھ کر سیاہ فام انسان نے زور سے چیخ ماری۔ ساری غار اس چیخ سے گونج اٹھی۔ لیکن یہ آواز اس دیو کے لئے معمولی تھی۔ ایک بار تو دریاکس بھی پنجرے کی لکڑی کی سلاخوں یعنی درختوں کے تنوں میں سے یہ خونی ڈرامہ دیکھ کر لرز گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے جس طرح کہ سیاہ فام انسان سمجھ گیا تھا کہ اُس کے ساتھ کس قسم کا وحشی سلوک ہونے والا ہے پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ جانے دیو کو کس بات کا خیال آگیا کہ اس نے نیزے کو وہیں زمین پر رکھا۔ سیاہ فام آدمی کو ایک جگہ دیوار کے ساتھ بٹھایا اور خود غار کا دروازہ پتھر سے بند کر کے باہر نکل گیا۔

س کے جاتے ہی سیاہ فام انسان نے اُٹھ کر باہر نکلنے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ اتنے میں دریاکس نے اُسے پنجرے میں سے آواز دی اور اپنی طرف متوجہ کیا۔ پہلے تو وہ سیاہ فام آدمی غار میں اپنے جیسے ایک دوسرے انسان کو قید دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اتفاق سے وہ دریاکس کی زبان جانتا تھا۔ دریاکس نے پنجرے میں سے جھانکتے ہوئے اُسے بتایا کہ دیو نے اُسے بھی بھون کر کھانے کے لئے قید کر رکھا ہے۔ ان دونوں کو وہاں سے فرار ہونے کی مل کر کوشش کرنی چاہیے۔ سیاہ فام آدمی نے کہا۔

"میں تمہاری طرف نیزہ پھینکتا ہوں۔ تم اس سے رسیاں کاٹنے کی کوشش کرو۔ پھر ہم مل کر غار کے بڑے پتھر کو سرکانے کی کوشش کریں گے۔"

سیاہ فام آدمی نے نیزہ اوپر اچھالا۔ تیسری بار کوشش کرنے سے نیزہ دریاکس نے پکڑ لیا۔ اس کا پھل کافی تیز تھا۔ اس نے پورا زور لگا کر رسی کاٹنی شروع کر دی۔ جلد ہی وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔ ایک شہتیر کٹ کر نیچے گر پڑا۔ اب وہاں اتنی جگہ پیدا ہو گئی تھی کہ دریاکس باہر نکل سکے۔ لیکن وہ چھلانگ لگا کر ہڈی پسلی نہیں تڑوانا چاہتا تھا۔ اس نے کئی موٹی رسیاں کو جوڑ جوڑ کر ایک لمبا رسہ بنایا اور اس کی مدد سے نیچے اتر آیا۔ سیاہ فام آدمی اور دریاکس نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ وہ غار کے بڑے پتھر کی طرف لپکے تاکہ اسے کسی نہ کسی طرح پرے ہٹا کر باہر بھاگ سکیں۔ انہوں نے زور لگانا شروع کر دیا۔ لیکن پتھر اتنا وزنی تھا کہ وہ اسے ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔ دونوں تھک کر چور ہو گئے۔ پسینے میں شرابور ہو گئے۔ رات بڑی گہری تھی۔ غار میں جو اودا اودا روشنی تھی اسی روشنی میں وہ ایک دوسرے کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ دریاکس نے کہا۔

"تم کون ہو؟ یہ دیو تمہیں کہاں سے پکڑ کر لایا ہے؟"

سیاہ فام نے دریاکس سے کہا کہ اس کا جواب وہ بعد میں دے گا۔ یہ وقت اس قسم کے سوال جواب کا نہیں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی طرح وہاں سے فرار ہو جائے۔ بعد میں وہ ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے۔ بات بڑی معقول تھی۔ دریاکس سوچ میں پڑ گیا۔ غار میں سے باہر نکلنے کی اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ آخر اسکے ذہن میں ایک تدبیر آ گئی۔ اس نے کہا۔

"سنو! اگر ہم صبح تک اس طرح ٹکریں مارتے رہے تو یہاں سے فرار نہ ہو سکیں گے۔ ہمارے لئے صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے۔ وہ یہ کہ ہم غار کے اس منہ بند دروازے کی دونوں جانب چھپ کر بیٹھ جائیں۔ دیو کسی کام سے باہر گیا ہے وہ واپس آ رہا ہو گا۔ جوں ہی وہ پتھر ہٹا کر اندر داخل ہو ہم اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر باہر بھاگ جائیں گے۔"

یہ تجویز بڑی معقول تھی۔ سیاہ فام آدمی نے کہا۔

"تمہاری تجویز مجھے پسند آئی ہے۔ ہم دیو کا انتظار کریں گے وہ ابھی کوئی دم میں آ رہا ہو گا۔"

"مگر وہ اچانک کہاں چلا گیا؟" دریاکس نے پوچھا۔

سیاہ فام انسان نے کہا۔

"وہ مجھے بھون کر کھانے لگا تھا۔ اس نے مجھے پتھر کے نیزے میں پرو کر آگ کے اوپر رکھ کر بھون دینا تھا۔ لیکن میری خوش قسمتی کہ وہ ایک خاص جھاڑی کے ترش پتے ساتھ لانا بھول گیا تھا جو انسانی گوشت کو بہت جلد گلا دیتے ہیں اور گوشت کے ذائقے کو مزے دار بھی بنا دیتے ہیں دیو وہی پتے لانے سمندر کے کنارے گیا ہے۔ بس آ رہا ہو گا۔"

دریاکس نے تعجب سے سیاہ فام کو دیکھ کر کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ ترش پتے انسانی گوشت کو مزے دار بنا دیتے ہیں۔ کیا تم نے انسانی گوشت کھایا ہے؟ کیا تم کہیں آدم خور تو نہیں ہو؟"

سیاہ فام انسان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بڑی گہری نظروں سے دریاکس کو دیکھتا رہا۔ پھر سر جھکا لیا۔ دریاکس اس سے کوئی دوسرا سوال پوچھنے لگا تھا کہ اسے باہر سے دیو کے چلنے کی آواز سنائی دی۔

"وہ آ گیا۔ خبردار ۔۔۔ ہوشیار! جس وقت میں اشارہ کروں۔ اسی وقت فوراً باہر کو بھاگنا۔"

"ٹھیک ہے۔"

دیو کے بھاڑ بھاری قدموں سے زمین میں دھمک سی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ غار کے منہ کے پاس آ کر رک گیا۔ پتھر آہستہ سے اپنی جگہ سے سرکنے لگا۔ یہ ایک بہت بڑے پتھر کی سل تھی۔ پھر پتھر پرے ہٹ گیا اور دیو جھک کر غار کے دروازے میں سے اندر داخل ہو گیا۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہونے لگا۔ سیاہ فام اور دریاکس غار کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ یہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ وہ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ دیو نے اندر آ کر آگ کے الاؤ کی طرف بڑھنے سے پہلے پتھر کو واپس اسی جگہ رکھنا تھا۔ اس ایک پل کے اندر اندر دریاکس نے اندھیرے میں ہی سیاہ فام کو اشارہ کیا کہ باہر کو بھاگو۔ چنانچہ دونوں باہر کو لپکے۔ باہر اندھیرا تھا۔ وہ پتھروں اور گڑھوں پر سے چھلانگیں لگاتے چٹان سے نیچے اترنے لگے۔ سیاہ فام کو راستے کا سارا علم تھا۔ وہ دریاکس کو اپنے پیچھے پیچھے لئے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ غار کے اندر سے دیو کی ہیبتناک آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ دریاکس اور سیاہ فام دونوں فرار ہو چکے ہیں۔ سیاہ فام نے دریاکس کی طرف منہ کر کے کہا۔

"جلدی سے میرے پیچھے پیچھے بھاگتے چلو۔ ہم چٹان کی پچھلی جانب جا کر سمندر میں چھلانگ لگائیں گے۔ بھاگو۔"

دریاکس اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں انہیں چٹان کا راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نیچے اترتے بے تحاشا بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ اب انہیں اپنے عقب میں دھم دھم کی آوازیں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ دیو ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ لیکن سیاہ فام وہاں کے تمام نشیب و فراز سے واقف تھا۔ وہ اسے ایسے علاقے میں لے گیا جدھر کا دیو کو کبھی خیال بھی نہیں آ سکتا تھا۔ یہاں نیچے سمندر کی لہریں چٹان سے ٹکرا کر واپس جا رہی تھیں اور شور اٹھ رہا تھا۔ سیاہ فام دریاکس کو لے کر چٹان میں لہروں کے قریب آ گیا۔

"میرے ساتھ سمندر میں چھلانگ لگا دو۔"

اتنا کہہ کر سیاہ فام سمندر کی جھاگ اڑاتی لہروں میں کود گیا۔ اس کے ساتھ ہی دریاکس نے بھی چھلانگ لگا دی۔ رات کے اندھیرے میں وہ دونوں تیرتے تیرتے کافی دور نکل گئے۔ دیو انہیں تلاش کرتا ہی رہ گیا۔ اس کے شور مچانے کی آواز انہیں دور تک آتی رہی۔ سمندر میں دریاکس اپنے سیاہ فام ساتھی کے پیچھے پیچھے تیرتا جا رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے قریب سے گزر رہے تھے ایک چٹان پر آ کر سیاہ فام رک گیا۔ دونوں سمندر میں سے نکل کر پتھروں پر بیٹھ گئے۔ دونوں تھک گئے تھے۔ دریاکس نے اس سے پوچھا۔

"آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

سیاہ فام نے کہا۔ "فکر مت کرو۔ میں تمہیں اس آدم خور دیو کی سرحدوں سے دور لے جا رہا ہوں۔ یہاں سے آدھے دن کے سفر پر ایک جزیرہ ہے۔ وہاں میرا گھر ہے۔ وہ سامنے والی بڑی چٹان کے عقب میں میری کشتی پڑی ہے۔ ہم اس پر سوار ہو کر صبح ہونے تک اپنے جزیرے پر پہنچ جائیں گے۔"

دریاکس نے پوچھا۔ "لیکن تم یہاں کیا کرنے آئے تھے؟"

سیاہ فام بولا۔ "کل پورے چاند کی رات ہے۔ ہمارے جزیرے پر کل ایک کنواری لڑکی کو دیوی پر قربان کیا جا رہا ہے۔ میں ایک تقریب کے لئے ایک خاص جڑی بوٹی کے پھول لینے آیا تھا کہ اس دیو کے چنگل میں پھنس گیا۔"

دریاکس نے کہا۔ "کیا تم لوگ اپنے دیوی دیوتاؤں پر انسانوں کو قربان کرتے ہو؟"

سیاہ فام نے کہا۔ "سچ بات تو یہ ہے کہ ہم آدم خور ہیں۔ ہم انسان کو بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ لیکن تم میرے دوست بن چکے ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ میں اس قبیلے کے سردار کا بیٹا ہوں۔ تمہارا میرے ساتھ جانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ صرف ہمارے جزیرے پر پہنچ کر ہی تم کسی دوسرے جزیرے کے لئے روانہ ہو سکتے ہو۔ یہاں رہو گے تو ایک نہ ایک دن ضرور اس خوفناک دیو کا تر لقمہ بن جاؤ گے۔"

دریاکس مجبور ہو گیا تھا کہ وہ سیاہ فام کے ساتھ جائے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ ان خطرناک چٹانوں میں بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ وہاں کسی وقت بھی دیو اُسے پکڑ سکتا تھا۔ کیا وہ سیاہ فام پر بھروسہ کرے؟ اس نے سوچا اور پھر یہی فیصلہ کیا کہ سیاہ فام کے ساتھ اس کے جزیرے پر چلا جائے۔

## داستان کا انجام

قسمت ایک عجیب اتفاق کے ساتھ دریاکس کو اُس کی محبوبہ فریانہ کے پاس لے جا رہی تھی۔ وہ اپنے سیاہ فام ساتھی کے ہمراہ جس جزیرے پر جا رہا تھا یہ وہی جزیرہ تھا جہاں فریانہ قید تھی اور جسے سردار کے حکم سے پورے چاند کی رات کو دیوی پر قربان کیا جانے والا تھا۔ وہ دونوں بڑی چٹان کے پاس پہنچے تو وہاں اس سیاہ فام کی کشتی ایک پتھر کے ساتھ بندھی تھی۔ کشتی میں سوار ہو کر انہوں نے جزیرے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ رات کا باقی حصہ وہ سمندر میں سفر کرتے رہے۔ صبح دم جب سورج کی روشنی پھیلی تو دریاکس نے سامنے ایک جزیرے کا ساحل دیکھا کہ اس کے کنارے کنارے ہرے بھرے درختوں کی ایک قطار دور تک چلی گئی تھی۔ سیاہ فام نے اُسے بتایا کہ یہی وہ جزیرہ ہے جہاں اُس کا باپ قبیلے پر سرداری کرتا ہے۔ یہی وہ آدم خوروں کا جزیرہ تھا جس کی ایک جھونپڑی میں دریاکس کی محبوبہ فریانہ قید تھی اور اپنی موت کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن اُس کا محبوب دریاکس اس حقیقت سے بے خبر تھا۔ کنارے پر جانے سے پہلے سیاہ فام نے اپنے منہ سے ایک آواز نکالی جو ایک لمبی چیخ تھی۔ اس چیخ کی آواز جزیرے میں پہنچی تو ننگ دھڑنگ آدم خور درختوں میں سے نکل کر ساحل پر آن جمع ہوئے۔ تھوڑی دیر میں ان کا سردار یعنی سیاہ فام کا باپ بھی آ گیا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو زندہ دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ اُسے گلے سے لگایا۔ دریاکس محسوس کر رہا تھا کہ دوسرے آدم خور اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں سیاہ فام ان کے لئے ایک شکار مار کر لایا تھا۔ وہ اس کو گرفتار کرنے والے تھے کہ سیاہ فام نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ سردار نے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

سیاہ فام نے کہا۔ "اس نے میری جان بچانے میں میری مدد کی تھی یہ ہمارا مہمان ہے۔ اسے ہم کچھ نہیں کہیں گے۔"

سردار نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ شخص اب ان کا مہمان بن کر رہے گا۔ اُسی وقت اُسے آدم خوروں نے اپنے کاندھے پر اٹھا لیا اور بڑی عزت کے ساتھ جلوس کی شکل میں لے کر جنگل میں اس جگہ آ گئے جہاں سردار کا بڑا جھونپڑے نما محل تھا۔ یہاں اس کے سیاہ فام بیٹے نے اپنی ساری سرگزشت سنائی۔ سردار دم بخود ہو کر رہ گیا جب اُسے یہ پتا چلا کہ اس کے بیٹے کو تو دیو نے گرفتار کر لیا تھا۔ سردار نے دریاکس کی بڑی آؤ بھگت کی اور اُسے اپنے بیٹے کے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ اس کے بعد سیاہ فام نے دریاکس کو اپنے ساتھ لیا اور جزیرے کی سیر کرانے نکل گیا۔ پھر وہ اتفاق سے اس جھونپڑے کے پاس سے گذرے جہاں دریاکس کی محبوبہ فریانہ قید تھی۔ دریاکس نے پوچھا کہ اس جھونپڑے کے باہر زبردست پہرہ کیوں بیٹھا ہے؟ سیاہ فام نے اُسے بتایا کہ اس جھونپڑے میں وہ لڑکی قید ہے جسے آج رات چاندنی میں دیوی کے قدموں میں ذبح کیا جائے گا اور اُس کا گوشت آدم خوروں میں بانٹ دیا جائے گا۔ دریاکس نے کہا۔

"کیا میں اس لڑکی کو ایک نظر دیکھ نہیں سکتا؟"

سیاہ فام اُسے لے کر جھونپڑی کے پاس آ گیا۔ وہ چونکہ سردار کا بیٹا تھا اس لئے اُسے جھونپڑی کے اندر جانے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ دریاکس کو لے کر جھونپڑی کے اندر داخل ہو گیا۔ جھونپڑی میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ دریاکس نے دیکھا کہ ایک لڑکی زمین پر لیٹی ہوئی ہے۔ اس نے اپنی دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا ہے اس نے کوئی خیال نہ کیا۔ اُدھر فریانہ نے بھی ذرا سی بانہہ پرے ہٹا کر یہ دیکھنا چاہا کہ اندر کون آیا ہے۔ جوں ہی اس کی نگاہ دریاکس پر پڑی تو اس کے منہ سے خوشی کی ایک چیخ نکل گئی۔ وہ اُٹھ کر اپنے محبوب کی طرف لپکی۔ اب دریاکس نے بھی اُسے پہچان لیا تھا۔ وہ تو ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔

"فریانہ! تم یہاں کہاں؟"

فریانہ دریاکس کے ساتھ لپٹ گئی اور روتے ہوئے اُسے بتانے لگی کہ وہ بڑی مصیبتیں اٹھانے کے بعد یہاں آئی تھی کہ اُسے ان لوگوں نے گرفتار کر لیا اور اب اسے چاندنی رات میں اپنی دیوی کے حضور ذبح کرنے والے ہیں۔ یہ سارا ماجرا سیاہ فام بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ اس کا محسن تو اس لڑکی کا عاشق نکلا تو وہ بھی بڑا حیران ہوا۔ دریاکس نے اپنے سیاہ فام دوست سے کہا۔

"بھائی! جس لڑکی کی تم آج رات قربان کرنے لگے ہو وہ میری منگیتر ہے ہم کسی مصیبت میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ میں اسی کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا کہ اس جزیرے پہ دیو کے قبضے میں آ گیا۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس لڑکی کی جان بخشی کے لئے اپنے باپ سے کہو۔ کیونکہ اگر یہ مر گئی تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا۔"

سیاہ فام گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے دریاکس سے کہا۔

"دوست! اس لڑکی کو ابھی یہیں رہنے دو اور میرے ساتھ باہر آؤ۔ ہم باہر چل کر بات کرتے ہیں۔"

دریاکس فریانہ کو اُسی جھونپڑی میں روتا چھوڑ کر سیاہ فام کے ساتھ باہر آ گیا۔ سیاہ فام نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی کہ دریاکس نے اپنی محبوبہ کو پہچان لیا ہے۔ وہ اُسے لے کر جزیرے کے مغربی کنارے پہ آ گیا اور ایک جگہ بیٹھ کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ دریاکس نے اُسے فکر مند دیکھا تو کہا۔

"دوست! تم کس سوچ میں پڑے ہو؟ معلوم ہوتا ہے کہ تم میری منگیتر کی جان بچانا نہیں چاہتے۔"

سیاہ فام نے کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے دوست! تم نے میری جان بچا کر مجھ

پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تمہاری منگیتر کی جان بخشی کے لئے اپنے باپ سے سفارش نہیں کر سکتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ہمارا مذہبی معاملہ ہے اگر اب میرے باپ نے اس لڑکی کی جان بخشی کر دی جس کو دیوی نے اپنے لئے پسند کر لیا ہے تو سارا قبیلہ اس کے خلاف ہو جائیگا اور اس کے محل پر حملہ کر کے اس کی اور میری سارے خاندان کی تکا بوٹی کر دے گا۔"

دریاکس نے کہا۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم مجبور ہو۔ لیکن میں اپنی منگیتر کو ذبح نہیں ہونے دوں گا۔ میں ہر حالت میں اس کی جان بچاؤں گا خواہ اس کے عوض مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑ جائے۔"

سیاہ فام نے کہا۔" میرا خیال ہے تم ایسا نہ کر سکو گے۔ نہ تم اپنی جان بچا سکو گے اور نہ اپنی محبوبہ کو ذبح ہونے سے بچا سکو گے۔"

دریاکس بولا۔" دوست! میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا میں خود ہلاک ہو جاؤں لیکن اپنی محبوبہ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

سیاہ فام سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر دریاکس کی طرف دیکھا اس کی نظروں میں کسی فیصلہ کن ارادے کی چمک تھی۔ اس نے دریاکس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

" دوست! تم نے میری جان بچا کر مجھے اپنے زیر احسان کر لیا ہے۔ اب مجھ پر فرض ہو گیا ہے کہ میں اس کے انعام میں تمہارے بھی کام آؤں۔ اس لئے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہاری محبوبہ کی جان بچانے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔ لیکن اس کے لئے تمہیں بھی بڑی ہمت کرنی ہو گی"

دریاکس کہنے لگا۔" میں اپنی محبوبہ پر اپنی جان بھی نچھاور کر سکتا ہوں تم کہو مجھے کیا کرنا ہو گا۔"

سیاہ فام بولا۔" تمہیں اپنی جان کی قربانی دینے کی بجائے زندہ رہ کر بہادری سے کام لینا ہو گا۔ میں اپنے باپ سے کہہ کر تمہاری محبوبہ کی جان بخشی نہیں کروا سکتا۔ لیکن اتنا خطرہ ضرور مول لے سکتا ہوں کہ تم دونوں کو یہاں سے فرار کروا دوں۔"

دریاکس سیاہ فام کی طرف تکنے لگا۔

" کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا تم ایسا کر سکو گے؟"

" کیوں نہیں؟" سیاہ فام نے اعتماد سے کہا۔" میں یہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا خطرہ مول لے لوں گا۔ کم از کم اس کے بعد میری اور میرے باپ کی زندگی ان آدم خوروں کے ہاتھوں محفوظ ہو جائے گی۔ ہاں پہرہ داروں کو ضرور قتل کر دیا جائے گا۔"

دریاکس نے پوچھا۔" ہم یہاں سے فرار کیسے ہوں گے؟"

سیاہ فام بولا۔ اس کا سارا بندوبست میں ابھی سے کر رہا ہوں۔ تم دونوں کو ایک کشتی مل جائے گی۔ اس میں کھانے پینے کی تھوڑی سی چیزیں بھی ہوں گی۔ تمہیں اس کشتی میں سوار ہو کر یہاں سے فرار ہونا ہو گا۔ اس کے بعد میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔ تمہیں سمندر میں داخل ہوتے ہی بڑی تیزی سے اس جزیرے سے دور نکل جانا ہو گا۔ تاکہ جب میرے قبیلے والوں پر لڑکی کے فرار کی حقیقت کا انکشاف ہو تو اس وقت تک تم دونوں بہت دور نکل چکے ہو۔ ہاں میں اتنا وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ آدھی رات سے پہلے پہلے کسی کو علم نہیں ہو گا کہ تم فرار ہو چکے ہو۔"

دریاکس نے سیاہ فام کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا اور خوش ہو کر کہا کہ وہ اس کا یہ احسان ساری زندگی فراموش نہیں کرے گا۔ سیاہ فام نے کہا۔

" وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔ مجھے ابھی جا کر تمہارے لئے کشتی کا بندوبست کرنا ہو گا۔ تم میرے ساتھ آؤ۔"

سیاہ فام دریاکس کو جنگل میں سے اپنے ساتھ لے کر جزیرے کے عقبی حصے میں آ گئے۔ یہاں جھاڑیاں بے حد گھنی تھیں۔ ان جھاڑیوں کے پیچھے سمندر کا ساحل نظر آ رہا تھا۔ وہاں دو تین کشتیاں سمندر کے کنارے پتھروں سے بندھی ہوئی تھیں۔ سیاہ فام دریاکس کو لے کر ان کشتیوں کے پاس آ گیا۔ اس نے اُسے ایک مضبوط اور بڑی کشتی میں بٹھایا اور کشتی لے کر سمندر میں جزیرے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جزیرے کے پیچھے وہ ایک ایسی چٹان کے پاس آ گیا جہاں ایک غار کا دہانہ سا بنا ہوا تھا۔ اس نے اس جگہ کشتی ایک پتھر کے ساتھ باندھ دی اور کہا۔

" تم لوگوں کو رات کے شروع میں ہی اس کشتی میں یہاں سے سوار ہو کر کھلے سمندر میں فرار ہو جانا ہو گا۔ میں تمہیں اس جگہ اپنے ساتھ اس لئے لایا ہوں تاکہ تم جگہ دیکھ سکو۔ اب تم میرے ساتھ واپس نہیں جاؤ گے بلکہ اکیلے جاؤ گے۔ اس کے بعد میں تم سے ملاقات بھی نہیں کروں گا تاکہ لوگوں کو بعد میں مجھ پر شک نہ ہو۔ تم جنگل میں کسی جگہ بھی جا کر چھپ جاؤ۔ یا آرام کرو۔ اب یہ میرا کام ہے کہ جھونپڑی میں جا کر پہرہ داروں کو بے ہوش کر کے رات کے اندھیرے میں تمہاری منگیتر کو نکال کر یہاں لاؤں۔ جب رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل جائے تو تم اس کشتی میں آ کر بیٹھ جانا اور میرا انتظار کرنا۔ میں تمہاری محبوبہ کو لے کر یہاں پہنچ جاؤں گا۔ اب میں جاتا ہوں۔"

دریاکس نے کہا۔" تمہیں دیوتاؤں کی قسم ہے کہ اپنے وعدے پر قائم رہنا۔ اگر تم نہ آئے تو میں اسی سمندر میں کود کر اپنی جان دے دوں گا۔"

سیاہ فام نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

" ہم لوگ جو وعدہ کرتے ہیں اُسے پورا کر کے دکھا دیتے ہیں خواہ اس میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ تم بے فکر ہو کر کشتی میں میرا انتظار کرنا۔ میں تمہاری محبوبہ کو لے کر رات کے پہلے پہر ہی یہاں پہنچ جاؤں گا۔ دیوتا تمہاری نگہبانی کریں۔"

اتنا کہہ کر سیاہ فام وہاں سے چلا گیا۔ دریاکس اُسے جنگل کے درختوں میں کچھ دور تک جاتا اُسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب دریاکس اکیلا رہ گیا تو اُسے طرح طرح کے وسوسوں نے گھیر لیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں سیاہ فام اسے دھوکا دے کر ہی تو نہیں چلا گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے اُسے دھوکہ دیا ہو اور اس سے اپنی جان بچائی ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے سردار باپ کی عزت پر حرف آنا گوارا کرے؟ پھر اس کو خیال آیا کہ ہو سکتا ہے وہ سچا ہو اور دل سے فریانہ کی جان بچانا چاہتا ہو۔ اتنا اسے معلوم تھا کہ یہ جنگلی لوگ جھوٹ نہیں بولا کرتے اور اپنے وعدے کے پکے ہوتے ہیں۔ کچھ دیر وہ کشتی میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ سیاہ فام پر بھروسہ کرنے کی بجائے اُسے خود فریانہ کو اغوا کر کے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ وہ اگر ساری زندگی بھی کوشش کرتا رہے تو اکیلا اس جزیرے سے فرار ہونے

میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ یہاں چاروں طرف آدم خور ہی آدم خور تھے۔ اور پھر بے گئے خونخوار پہریداروں کی موجودگی میں اپنی محبوبہ کو اغوا کر کے لانا پہاڑ توڑ کر نہر نکالنے والی بات تھی۔ اس نے اپنا سر تھام لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اُدھر سیاہ فام نے اپنی مہم کی رفتار تیز تر کر دی تھی۔ وہ دریاکس سے جدا ہو کر سیدھا اپنے گھر گیا۔ وہاں سے اُس نے خفیہ طور پر ایک جھولے میں کھانے پینے کی چیزیں رکھیں اور اُسے جنگل میں ایک جگہ جا کر چھپا آیا۔ اس کے بعد اُس نے تیر کمان لیا اور اس جھونپڑی کی طرف چل پڑا جس میں دریاکس کی محبوبہ قید تھی۔ جھونپڑی کے باہر ایک درخت کے پیچھے وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔

اب شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جھونپڑیوں کے درمیان گھاس کے میدان میں فریانہ کو قربان کرنے کی رسومات کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ آگ روشن کر دی گئی تھی اور آدم خور اس کے گرد رقص کر رہے تھے اور بلند آواز میں مذہبی گیت گا رہے تھے۔ جھونپڑی کے اندر فریانہ کے گلے میں بھی پھولوں کے ہار ڈال کر اسے قربانی کے لئے تیار کر دیا گیا تھا۔ سیاہ فام نے دیکھا کہ کچھ لوگ آئے اور فریانہ کی جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ فریانہ کے سر میں مقدس تیل ڈالنے آئے ہیں۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ جھونپڑی سے باہر نکل آئے اور واپس اُس طرف چلے گئے جدھر قربانی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد سورج مغرب میں غروب ہو گیا اور جزیرے کے جنگل میں اندھیرا چھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی پورا چاند بھی آسمان پر طلوع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے جنگل میں ہلکی ہلکی نیلی روشنی پھیل گئی تھی۔ اس روشنی میں سیاہ فام کو دونوں پہریدار صاف نظر آ رہے تھے۔ اب وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ سیاہ فام نے تیر نکال کر اُسے کمان کے ساتھ جوڑا اور ایک پہریدار کا نشانہ باندھا۔

یہ پہریدار گشت کرتے کرتے پیٹھ سیاہ فام کی طرف کر کے ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ سیاہ فام اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ایک پل بھی ضائع نہ کیا اور تیر چلا دیا۔ یہ تیر بڑے ہلاکت خیز زہر میں بجھا ہوا تھا۔ تیر سیدھا پہریدار کی پشت پر لگا اور دل کے آر پار ہو گیا۔ پہریدار اُف کئے بغیر زمین پر گر پڑا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا پہریدار شور مچاتا سیاہ فام نے دوسرا تیر بھی چلا دیا۔ یہ تیر دوسرے پہریدار کے سینے میں لگا اور دل میں پیوست ہو گیا۔ یہ پہریدار بھی گر پڑا۔

سیاہ فام بھاگ کر درختوں میں سے نکلا اور سیدھا جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔ فریانہ حسرت و یاس کی تصویر بنی جھونپڑی کے اندر بیٹھی اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی تھی۔ وہ ایک سیاہ فام کو اندر آتے دیکھ کر بالکل حیران نہ ہوئی۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ شخص اُسے قربانی کے لئے لینے آیا ہے۔ سیاہ فام نے اُس کے قریب جا کر کہا۔

"جلدی سے اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔ دریاکس چٹانوں کے پاس کشتی میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ جلدی کرو وقت ضائع نہ کرو۔"

فریانہ اس کا منہ تکتی رہ گئی۔ سیاہ فام نے کہا۔

"میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ جلدی کرو۔ اٹھو۔"

فریانہ کو اب ہوش آیا کہ یہ شخص اس کا مسیحا بن کر آیا ہے۔ مرنا تو اُسے تھا ہی۔ پھر کیوں نہ اس پر بھروسہ ہی کرے۔ یہ سوچ کر فریانہ تیزی سے اٹھی اور سیاہ فام اُسے جھونپڑی میں سے نکال کر باہر آ گیا۔ باہر آ کر فریانہ نے دونوں پہریداروں کی لاشیں دیکھیں تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ شخص سچا ہے اور سچ مچ دریاکس کے پاس ہی لے جا رہا ہے۔ سیاہ فام فریانہ کو لے کر گھنے جنگل میں آ گیا۔ وہ دونوں بھاگتے چلے گئے۔ فریانہ ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر پڑی تو سیاہ فام نے اُسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم نے اس وقت ہمت ہار دی تو پھر تمہاری قسمت میں سوائے المناک موت کے اور کچھ نہیں لکھا ہو گا۔ اٹھو اور میرے ساتھ بھاگو۔ رکنا تمہاری موت ہے۔"

فریانہ کو اب خود بھی موقع کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کی قربانی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ آدم خور کچھ دیر میں اُسے لینے کے لئے آنے ہی والے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ انہیں اس کے فرار کا علم کوئی دم میں ہونے والا تھا۔ اس لحاظ سے انہیں جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا ہو گا۔ فریانہ سیاہ فام کے ساتھ تیزی سے بھاگتی چلی گئی۔ آخر وہ اُسے لے کر جنگل کے دوسرے کنارے پر آ گیا۔ یہاں سمندر کنارے چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اسی جگہ دریاکس کشتی میں بیٹھا بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جب سیاہ فام اور فریانہ کو اپنی طرف بھاگ کر آتے دیکھا تو خوشی سے اس کا جسم رقص کرنے لگا۔ سیاہ فام نے آخر اپنا وعدہ پورا کر دکھایا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

فریانہ نے دریاکس کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ کہاں تو یہ کہ وہ موت کے منہ میں جا رہی تھی۔ کوئی دم میں اس کی قربانی ہونے والی تھی۔ آدم خور اُسے ذبح کرنے کے لئے چھریاں تیز کر رہے تھے اور کہاں یہ کہ وہ اپنے محبوب کی آغوش میں جا رہی تھی اور زندگی کے ساحل پر لوٹ رہی تھی۔ اس سے بغلگیر ہونے کو بے تاب تھیں۔ فریانہ دریاکس سے لپٹ گئی۔ سیاہ فام نے راستے میں جنگل سے وہ تھیلا بھی اٹھا لیا تھا جس میں کھانے پینے کی چیزیں بند تھیں۔ اس نے تھیلا کشتی میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"جلدی سے کشتی میں لیٹ جاؤ۔"

دونوں کشتی میں لیٹ گئے۔ سیاہ فام نے تیزی سے چپو چلا کر کشتی کو چٹانوں سے باہر نکال لیا اور اُسے لے کر کھلے سمندر کی طرف بہنے لگا۔ اس نے ذرا دور جا کر دریاکس سے کہا۔

"دوست! اب تم چپو سنبھالو۔ اب تم آزاد ہو۔ اب سے تمہاری ذمہ داری کا آغاز ہوتا ہے اور میرے فرض کی سرحد ختم ہوتی ہے۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی گلہ نہیں ہو گا۔"

دریاکس نے اُسے گلے لگا کر کہا۔

"میرے بھائی! تم نے وہ کام کر دکھایا ہے کہ مجھے ساری زندگی کے لئے خرید لیا ہے۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ بلکہ غار میں بھی تم نے ہی نیزہ میری طرف پھینک کر میری زندگی بچائی تھی۔ لیکن اس وقت تم نے اپنی اور اپنے سارے خاندان کی زندگی اور عزت کو داؤ پر لگا کر فریانہ کی زندگی بچائی ہے۔ میں جب تک زندہ رہا تمہارے احسان کو یاد رکھوں گا اور مرنے کے بعد میرے بچے تمہارے احسان کو آپس میں دہراتے رہیں گے۔"

سیاہ فام نے کہا۔ "دوست! باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے کشتی لے کر جزیرے کی حدود سے باہر نکل جاؤ۔ آدھی رات ہونے والی ہے۔ وہ لوگ قربانی کے لئے ابھی فریانہ کو لینے جا رہے ہوں گے۔ انہیں جونہی علم ہوا کہ تم لوگ فرار ہو گئے ہو۔ وہ اپنی کشتیوں میں سوار ہو کر تیروں کی طرح تمہارا پیچھا کریں گے۔"

دریاکس نے سیاہ فام کو ایک بار پھر گلے لگایا اور چپو سنبھال لئے۔ سیاہ فام نے اسی وقت سمندر میں چھلانگ لگا دی اور اندھیرے میں واپس جزیرے کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ فریانہ اسے اندھیری رات اور چاند کی روشنی میں واپس تیرتے دیکھتی

رہی۔ دریاکس نے چپو سنبھال لئے تھے اور اندھادھند کشتی کھیے رہا تھا۔ کشتی بڑی تیزی سے جزیرے سے دور ہونے لگی۔ چاندنی سمندر پر کھلی ہوئی تھی اور کشتی دُور سے بھی نظر آ رہی تھی۔ فریانہ نے کہا۔

"خدا کے لئے دریاکس کشتی تیز چلاؤ۔ وہ ہمیں دور سے دیکھ لیں گے۔ پھر وہ میرے ساتھ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

دریاکس نے اور تیز کشتی کھینا شروع کر دی۔ تھوڑی دیر میں وہ کشتی کو وہاں سے نکال کر کھلے سمندر میں لے گیا۔ چاندنی رات میں جزیرے کا ساحل ایک سیاہ لکیر کی طرح بہت دور دکھائی دینے لگا۔ اب ذرا اُدھر کی بھی سُنو کہ وہاں کیا ہوا۔ کہانی بیان کرنیوالا چاندنی رات میں جزیرے کے حسن کے منظر کو بڑے سحر انگیز طریقے سے بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ جُوں ہی جزیرے کی سب سے اونچی چٹان پر آدھی رات کی نوبت بجی الاؤ کے گرد رقص کرنے والے آدم خوروں کی لے تیز ہو گئی۔ آگ میں اور ایندھن ڈال دیا گیا۔ شعلے اور بھڑکنے لگے۔ آسمان پر چاند بھی بڑی گہری روشن نگاہ سے یہ کچھ دیکھ رہا تھا۔ سردار ایک اونچی چٹان پر بیٹھا تھا۔ دیوی کا بت بیچ میں لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ پجاری شلوک پڑھ رہے تھے۔ آدم خور اپنے اپنے حصے کا گوشت کاٹنے کے لئے چھریاں تیز کر رہے تھے۔ بڑا جلاد سارے جسم پر بکرے کا سُرخ خون ملے ہاتھ میں کلہاڑا لئے تیار کھڑا تھا۔

اتنے میں سردار نے ہاتھ کے اشارے سے حکم دیا کہ فریانہ کو لایا جائے اور قربانی شروع کی جائے کیونکہ آدھی رات کا وقت ہو گیا ہے۔ اس اشارے کا جواب آدم خوروں نے خوشی سے نعرے لگا کر دیا۔ پانچ آدمیوں کا ایک آدم خوروں کا ایک وفد فریانہ کی جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ وہ مدھم آواز میں مذہبی گیت گاتا جا رہا تھا۔ چاندنی رات میں سارے جنگل میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جونہی یہ آدم خور جھونپڑے کے پاس پہنچے تو ٹھٹک کر رہ گئے۔ جھونپڑے کے باہر دونوں پہرےداروں کی لاشیں پڑی تھیں۔ وہ بھاگ کر جھونپڑے کے اندر گئے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے مل کر ایک بھیانک چیخ بلند کی۔ اس چیخ کی دہشت ناک آواز الاؤ کے گرد بیٹھے آدم خوروں اور ان کے سردار نے بھی سُن لی اور سمجھ گئے کہ شکار فرار ہو گیا ہے۔ سیاہ فام اپنے باپ کے قریب ہی بیٹھا یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ پانچوں آدم خور بھاگتے ہوئے واپس آئے اور انہوں نے آ کر بتایا کہ جس لڑکی کو دیوی نے پسند کیا تھا اور جس کی قربانی دی جانے والی تھی وہ فرار ہو گئی ہے۔ سردار غصے میں لرز کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سارے وحشی اپنی جگہ پر نیزے بلند کر کے کھڑے ہو گئے۔ سردار نے چیخ کر کہا۔

"اُن کا پیچھا کرو۔ وہ ضرور کسی کے ساتھ سمندر میں ہو گی۔"

آدم خور دیوانوں کی طرح کشتیوں میں سوار ہو کر سمندر میں چاروں طرف پھیل گئے اور نعرے لگاتے بڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ ایک ایک کشتی پر پچاس پچاس آدم خور سوار تھے اور بڑی تیزی سے چپو چلا رہے تھے۔ ان کی کشتیاں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں۔ دریاکس اور فریانہ کی کشتی اگرچہ جزیرے سے کافی دور آگے نکل گئی تھی۔ پھر بھی اُس نے دُور جزیرے کی طرف سے آنے والے وحشیوں کی آوازیں صاف سُن لیں۔

فریانہ کانپ کر دریاکس کے ساتھ لگ کر بولی۔

"پیارے! وہ لوگ ہمارا پیچھا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ ہمیں پکڑ لیں گے۔"

فریانہ رونے لگی۔ دریاکس نے اُسے تسلی دے کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں فریانہ! جس مقدس دیوتا نے ہمیں اس بھیانک دیوی سے بچا کر آپس میں ملایا ہے وہی مقدس دیوتا اب ہمیں ان وحشی آدم خوروں سے بھی بچائیگا۔ تم خاموشی سے کشتی میں بیٹھی رہو۔"

فریانہ دوزانو ہو کر کشتی میں بیٹھ گئی۔ دریاکس بڑا طاقتور نوجوان تھا۔ وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ کشتی کھینے لگا۔ کشتی چاندنی رات میں آگے ہی آگے بڑھنے لگی۔ جزیرے کی سیاہ لکیر اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ لیکن اب ایک اور سیاہ لکیر وہاں ابھر رہی تھی۔ دریاکس نے غور سے دیکھا تو یہ سیاہ لکیر حرکت کر رہی تھی اور اس کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ کیونکہ یہ سیاہ لکیر نہیں تھی بلکہ وہی آدم خور وحشی تھے جو اپنی کشتیوں میں ان کی طرف دیوانہ وار بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

اب ان کی ہلکی ہلکی آوازیں بھی ان تک پہنچنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ آدم خوروں نے بھی فریانہ اور دریاکس کی کشتی کو دیکھ لیا تھا۔ فریانہ نے جب آدم خوروں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ لرزتی آواز میں بولی۔

"دریاکس! وہ لوگ آ گئے!"

اور اتنا کہہ کر فریانہ بے ہوش ہو کر کشتی میں گر پڑی۔ دریاکس نے دل میں سوچا کہ یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔ کیونکہ وہ اس کے لئے الگ ایک پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اگر وہ زندہ بچ گیا تو اُسے ہوش میں لے آئے گا۔ اب اس کی سب سے بڑی پریشانی کسی نہ کسی طرح اپنی کشتی کو ان آدم خور وحشیوں سے دور لے جانے کی تھی۔ مگر وہ لوگ دم بدم اُس کے قریب سے قریب تر آ رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی رفتار بہت تیز تھی۔ سب سے بڑی مصیبت اس وقت چاندنی رات تھی جس کی روشنی میں آدم خور اپنے بھاگتے ہوئے شکار کو صاف دیکھ رہے تھے۔ اگر رات اندھیری ہوتی تو وہ ضرور اندھیرے میں چھپ جاتا۔ مگر دریاکس تو اب آدم خوروں کو کشتی کھیتا صاف نظر آ رہا تھا۔ آدم خوروں نے زور زور سے چیخنا اور چلانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے شکار کے قریب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایسا ہوا کہ آدم خوروں کی کمانوں سے نکلے ہوئے تیر دریاکس کی کشتی کے اردگرد گرنے لگے۔ دریاکس اگرچہ گھبرا گیا تھا لیکن جلد ہی اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور جتنی تیزی سے وہ چپو چلا سکتا تھا اس نے چپو چلانے شروع کر دیئے۔ اس وقت اگر فریانہ ہوش میں ہوتی تو اس نے رو رو کر آسمان سر پہ اٹھا لیا ہوتا۔ دریاکس نے دیوتاؤں کا شکر ادا کیا کہ وہ بے ہوش تھی۔ لیکن اب اس کی جان بچانا بھی اُس پر فرض ہو گیا تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر وہ پکڑا گیا تو فریانہ کا اپنے ہاتھوں کام تمام کر کے آدم خوروں کے ساتھ جنگ کرتا ہوا خود بھی ہلاک ہو جائے گا۔

آدم خور اس کے بہت نزدیک آ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری کشتیوں کو کچھ اس طرح کھینا شروع کیا تھا کہ دریاکس کی کشتی کے اردگرد گھیرا کر لیا جائے اور پھر یہ گھیرا تنگ ہونا شروع ہو گیا۔ آدم خوروں کے تیر اب اس کی کشتی میں بھی آ کر گرنے لگے۔ موت سامنے آن کھڑی ہوئی۔ دریاکس نے محسوس کیا کہ اب وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔ فریانہ کشتی میں اسی طرح بے ہوش پڑی تھی۔ ایک کشتی میں خود سردار کھڑا آدم خوروں کو آگے بڑھنے کا حکم دے رہا تھا۔ ٹھیک اس وقت دریاکس نے دونوں چپو کشتی میں ڈال دیئے اور دوزانو ہو کر خدا سے دعا کی کہ اے مقدس دیوتاؤں کے رب! میری اور میری منگیتر کی ان آدم خوروں سے جان بچا! وہ سر جھکائے دعا مانگتا رہا اور تیر کشتی میں آ کر گرتے رہے۔ آدم خوروں کا گھیرا تنگ ہوتا گیا۔ ان کی چیخیں اسکے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔ وہ اپنے شکار کو اپنے جنگل میں بے بس دیکھ کر زور زور سے چلا رہے تھے۔ دریاکس نے فریانہ

کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اس خیال سے کہ اگر کوئی تیر آکر لگے تو اُسے لگے۔ فریانہ محفوظ رہے۔ اُس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور دل برابر خدا کے حضور میں سجدہ ریز تھا اور برابر دعا مانگ رہا تھا۔

اب وہاں ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا۔ کہانی سُننے والے کہتے ہیں کہ یہ دیوتاؤں کی کرامت تھی۔ دیوتا دو محبت کرنیوالوں کی مدد کو آگئے تھے۔ اور کہانی بیان کرنیوالے یونان کے مشہور داستان گو فیوبس کا بیان ہے کہ عین اسوقت جب کہ آدم خور، دریاکس کی کشتی کے قریب پہنچ رہے تھے سمندر کی فضا میں ایک بھیانک کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی چیخ بلند ہوئی۔ یہ آواز اس قدر ہیبت ناک تھی کہ جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ اور کوئی ستارہ سمندر میں ٹوٹ کر گر پڑا ہو۔ آدم خور وحشی گھبرا کر ادھر اُدھر تکنے لگے۔ ایک طرف سے انہیں چٹانوں کے جزیرے کے بھیانک اور قوی الجثہ دیو کا ہیولہ دکھائی دیا جو بیچ سمندر میں سے ان کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں بڑی بڑی چٹانیں اٹھا رکھی تھیں۔ وہ ایک عظیم پہاڑ کی طرح ان کی طرف بڑھ کر ان کے سروں کے اوپر آکر کھڑا ہو گیا۔ پھر دیو نے دونوں چٹانیں آدم خوروں کی کشتیوں پر پھینک دیں۔

چٹانوں کے گرتے ہی آدم خوروں کی آدھی کشتیاں کھلونوں کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر سمندر میں ڈوب گئیں۔ آدھے سے زیادہ آدم خور ان کشتیوں کے ساتھ ہی سمندر میں ڈوب گئے۔ دریاکس یہ سارا منظر اپنی کشتی میں سہما بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کانپ رہا تھا کہ دیکھیں اب اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔ یہ وہی دیو تھا جس کی قید سے وہ فرار ہو کر بھاگا تھا۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ دیو دریاکس کو کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ اس افراتفری اور ہنگامہ میں فریانہ کو بھی ہوش آگیا۔ اس نے جو اپنے اردگرد قیامت صغریٰ کا منظر دیکھا۔ آدم خور وحشیوں کے ساتھ ساتھ اس سینگ والے طویل القامت قوی الجثہ بھیانک دیو کو بھی دیکھا تو چیخ مار کر کشتی میں ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی۔ دیو اب دریاکس کی کشتی کے بالکل اوپر آگیا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دریاکس کی کشتی کو پناہ میں لئے ہوئے ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کر آدم خوروں کی کشتیوں کو اوپر اٹھاتا اور اسے اپنی مٹھی میں چرمر کر کے سمندر میں پھینک دیتا تھا۔ وہاں آدم خوروں کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے آدم خوروں کی ساری کی ساری کشتیاں سمندر میں ٹوٹ پھوٹ کر غرق ہو گئیں۔

کچھ آدم خود سمندر میں تیر کر واپس بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے کہ دیو نے انہیں بھی باری باری سمندر میں سے اٹھا کر اپنی مٹھی میں مسل مسل کر نیچے پھینک دیا۔ اب سمندر میں سوائے دریاکس کی کشتی کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ دیو اُسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اب ضرور اس کی باری ہے۔ لیکن دیو نے اُسے کچھ نہ کہا اور چپکے سے سمندر میں تیرتا ہوا واپس چلا گیا۔ دریاکس کو یوں محسوس ہوا کہ ایک پہاڑ تھا جو سمندر میں تیرتا ہوا جا رہا تھا۔ چاندنی رات میں یہ پہاڑ آہستہ آہستہ سمندر میں ایک طرف کو بہتے بہتے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ دریاکس خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ خدا نے اس کی دعا قبول کر لی تھی اور ان دونوں کو آدم خوروں کے ہاتھوں موت کا لقمہ بننے سے بچایا تھا۔ اس نے جلدی سے فریانہ کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر اُسے بیدار کیا۔ فریانہ ہوش میں آکر دریاکس سے چمٹ گئی۔

"مقدس دیوتاؤں کے دیوتا کا شکر ادا کرو فریانہ! ہماری جان بچ گئی ہے۔ خدا نے ہمیں وحشی آدم خوروں کے شکنجے سے نجات دلا دی۔ وہی دیو ہماری مدد کو آیا جس نے کبھی میری جان لینے کی کوشش کی تھی۔"

فریانہ کو یقین نہیں آرہا تھا۔ لیکن حقیقت اس کے سامنے تھی۔ انہوں نے کشتی چلانی شروع کر دی اور سمندر میں اپنا سفر ایک بار پھر سے شروع کر دیا۔ ساری رات دریاکس کشتی کھیتا رہا اور فریانہ سو گئی۔ صبح طلوع ہوئی تو وہ کھلے سمندر کے بیچ میں تھے اور ان کی کشتی اپنے آپ ہی چل جا رہی تھی۔ سارا دن اور ساری رات اور پھر سارا دن وہ سمندر میں سفر کرتے رہے۔ اسی طرح سفر کرتے کرتے انہیں چھ روز گذر گئے۔ اب ان کے پاس صرف کھانے پینے کا اتنا ذخیرہ رہ گیا تھا کہ وہ اس پر مزید دو دن تک گذارہ کر سکتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کا دو دن کے اندر اندر کسی ساحل پر جا لگنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ دریاکس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُن کی کشتی کس سمت کو جا رہی ہے۔ کہیں وہ پھر کسی آدم خوروں کے جزیرے پر تو نہیں پہنچ جائیں گے۔ لیکن اُسے سیاہ فام کی بات یاد آگئی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر وہ شمال کی سمت ستاروں کی رہنمائی میں سفر کرتے رہے تو چھ سات روز کے بعد انہیں زمین مل جائے گی اور یہ زمین بحیرہ روم کا شمالی ساحل ہو گا۔ بحیرہ روم کے شمالی ساحل سے مراد سوائے یونانی جزیروں کے اور کچھ نہ تھا۔ ان کی منزل مقصود یونان کا ساحل ہی تھا۔ یہاں پہ داستان بیان کرنے والا اپنی کہانی کو یوں ختم کرتا ہے کہ ایک روز اُن کی کشتی یونان کے ایک جزیرے پر پہنچ گئی اور وہ اپنے وطن واپس آگئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے شادی کر لی اور باقی زندگی خوش و خرم بسر کی۔

## داستان گوئی برصغیر میں

فیوبس کی اس شاہکار اور بے نظیر کہانی کے بعد ہم برصغیر پاک و ہند میں آتے ہیں۔ برصغیر کی قدیم ترین تہذیب یعنی موہنجو داڑو کے عہد کی داستانیں ہمیں بہت کم ملتی ہیں۔ موہنجو داڑو ہماری برصغیر کی قدیم تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جس کے اوراق ماضی کے اندھیروں میں گم ہیں۔ تہذیبیں مٹتی ہیں تو ان کی روایات اگلی نسلوں میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ لیکن موہنجو داڑو کی تہذیب اور اس کی روایات کا سلسلہ ہمیں آج سے پانچ ہزار برس پہلے اچانک منقطع ہوتا نظر آتا ہے۔ اس قدیم اور ترقی یافتہ تہذیب کو جیسے اچانک کسی زلزلے نے نگل لیا کہ پھر اس کی روایت کا ایک ورق بھی آگے نہ چلا۔ اس کے باوجود جب سے موہنجو داڑو اور اس کی جڑواں بہن ہڑپہ کے آثار دریافت ہوئے ہیں اس پر مغربی ممالک میں کافی تحقیق ہوئی اور بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے۔ میری نظر سے جو کتابیں گذریں وہ ساری تقریباً موہنجو داڑو میں رہنے والے لوگوں کے حسن تعمیر اور ان کی صنائی اور مذہبی رسومات کے بارے میں تھیں۔ ان کے علاوہ دو ایک کتابیں ایسی بھی تھیں جن میں اُن کی ڈانسنگ گرل کے حوالے سے وہاں کے رہنے والوں کی بُت پرستی کے سلسلے کو دجلہ اور فرات کی وادی کی تہذیب خاص طور پر بابل و نینوا کے عروج کی تہذیب سے ملایا گیا تھا۔

یہ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ راقم الحروف کو ڈھاکہ کی ایک لائبریری میں ایک کتاب مل گئی۔ اس کتاب کا نام تھا "Stories and Story tellers of Moenjodaro." یہ کتاب ماڈرن لائبریری نیویارک کی چھپی ہوئی تھی اور اس کے مصنف کا نام جیمز پالٹون تھا۔ میں جتنے روز ڈھاکہ میں رہا اس کتاب کو شوق سے پڑھتا رہا۔ یہ کتاب کافی ضخیم تھی اور اس میں موہنجو داڑو کی تہذیب کے دور عروج میں جو کہانیاں بلکہ لوک کہانیاں مشہور تھیں ان کا تفصیل سے ذکر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ چند ایک کہانی سنانے والوں کا بھی ذکر تھا۔ مؤلف مسٹر جیمز نے دیباچے میں اپنے اس عجز کا خاص طور پر اظہار کیا تھا کہ اُسے موہنجو داڑو کے قدیم داستان گوؤں

کے بارے میں زیادہ مواد نہیں مِل سکا۔ لندن لائبریری سے اس نے کچھ پُرانی تختیاں دیکھیں اور کچھ کتابیں اُس کے زیرِ مطالعہ رہیں جو موہنجو داڑو کے پُرانے داستان گوؤں کے بارے میں لکھی گئی تھیں۔ جیمز پال سٹون نے اپنی کتاب میں اُن کتابوں کے باقاعدہ حوالے دیئے جاتے تھے جن میں مجھے ایک کتاب یاد رہ گئی ہے جس کا نام "Moenjodaro in Stories." اِس کتاب کے مؤلف کا نام میں بھُول گیا ہوں۔

مسٹر جیمز پال سٹون کی کتاب بڑی معلومات افزا تھی اور میں نے ایسی کتاب اس موضوع پر پہلے کوئی نہیں پڑھی تھی جس میں اتنی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ موہنجو داڑو کی پُرانی کہانیوں اور پُرانے قصّہ گوؤں کے بارے میں لکھا گیا ہو۔ اس میں کوئی دو سو کے قریب ایسی لوک کہانیاں دی گئی تھیں جو مؤلف کے خیال میں اُس زمانے میں مائیں اپنے بچوں کو سنایا کرتی تھیں۔ یہ ساری کہانیاں میں نے پڑھی ہیں۔ مختصر کہانیاں تھیں اور سب کا موضوع دیوتا، مذہب اور زمین کے ساتھ پیار اور بچوں سے محبت تھا۔ تقریباً ہر کہانی میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ کھیت دھرتی کا سنگار ہے۔ کھیت ہی ہمیں اناج دیتا ہے اور ہماری پرورش کرتا ہے۔ اناج کے دیوتا کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی شیطان کا کردار اس آگ کے شعلے آسمانی بجلی اور طوفانی بارش میں زیادہ واضح ہوتا تھا جو پکے ہوئے اناج کو برباد کرتی ہے۔ ہر کہانی میں ایک بیل ضرور تھا۔ یہ بیل بابل و نینوا کے بُت خانوں سے نکل کر اس تہذیب کی روایات کا جزو بن گیا تھا۔ یہ بیل ہر کہانی میں ایک مندر میں بُت کے روپ میں ہوتا جس سے بچے اور اناج کے لئے وقت پر بارش مانگی جاتی تھی۔ ہر کہانی میں اس آدمی پر دیوتاؤں کی رحمت کی بارش ہوتی جس کے ہاں زیادہ لڑکے پیدا ہوتے تھے۔ ہر کہانی کا انجام بخیر دکھایا گیا تھا۔ ان کہانیوں میں جن بھُوت بھی تھے۔ چڑیلیں بھی تھیں ایسے دیوتا بھی تھے جو انسانوں کی مدد کرتے تھے۔ ایسے دیوتا بھی تھے جو مندروں میں رقص کرنے والی حسین دوشیزاؤں کو اغوا کر کے لے جاتے تھے۔

یہ تو وہ کہانیاں تھیں جنہیں ہم لوک کہانیاں کہہ سکتے ہیں۔ علاوہ بریں کتاب میں وہ چند ایک کہانیاں بھی درج تھیں جو اُس زمانے کے موہنجو داڑو کے کہانی سنانے والے سنایا کرتے تھے۔ یہ عجیب و غریب اور دلفریب کہانیاں تھیں۔ ان میں قسم قسم کا رنگ اور آہنگ تھا۔ یہ کہانیاں قدیم مصری اور یونانی کہانیوں سے اپنے پلاٹ اور تاثیر کے اعتبار سے بہت آگے تھیں۔ میں نے یہ ساری کہانیاں پڑھیں۔ مصنف نے اس زمانے کے قدیم قصّہ گوؤں کے بارے میں بعض بڑی ہی دلچسپ باتیں لکھی تھیں۔ یونان اور مصر کے قدیم داستان گوؤں کے برخلاف قدیم موہنجو داڑو کے داستان گو ہمیں اپنے مکانوں کی بیٹھکوں میں داستان کی محفل گرم کرتے ملتے ہیں۔ یونان اور مصر کے داستان گو تو کارواں سراؤں، قہوہ خانوں اور دریا کنارے محفلیں سجا کر سرِشام داستان سرائی کرتے تھے جب کہ موہنجو داڑو کے داستان گو عام طور پر ایسا نہیں کرتے تھے۔ وہ جیسا کہ جیمز پال سٹون لکھتا ہے یونانی اور مصری داستان گوؤں کے مقابلے میں زیادہ خود دار تھے۔ وہ اپنے گھروں میں سرِشام مشعل جلا کر ایک تخت پر بیٹھ جاتے اور جو لوگ وہاں جمع ہوتے انہیں اپنی داستان سناتے۔ گرم اور خوشگوار موسم کی شاموں میں گھر کے صحن میں چھڑکاؤ کر کے دریاں اور لکڑی کا تخت بچھا دیا جاتا۔ لوگ اپنے اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر وہاں جمع ہونا شروع ہو جاتے۔ ٹھیک وقت پر داستان گو لمبا سا نیلے رنگ کا چغہ پہنے نمودار ہوتا۔ حاضرین اٹھ کر اس کا خیر مقدم کرتے۔ وہ سب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتا اور پھر خود بھی تخت پر بیٹھ کر اپنی کہانی کا آغاز کرتا۔

اپنی کتاب میں جیمز پال سٹون نے ایک مشہور موہنجو داڑوین داستان گو کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ اُس کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ اپنے زمانے میں وہ اس قدر مشہور اور ہر دلعزیز تھا کہ لوگ اُسے بیاہ شادیوں اور خوشی کی تقریبات میں خاص طور پر بلاتے تھے۔ گھروں میں کہانیاں سُننے والے داستان گو کے مرتبان میں اپنی اپنی حیثیت کے مطابق سکّے ڈالتے جاتے تھے۔ یہ مرتبان ہر داستان گو کے دروازے پر شام کے وقت رکھ دیا جاتا تھا۔ جس داستان گو کا جیمز پال سٹون نے ذکر کیا ہے وہ ایسا کرنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔ وہ بھی اپنی بیٹھک اور گھر کے صحن میں ہی اپنی داستان کی محفل لگاتا تھا۔ لیکن اُس کا قیمت یا ٹکٹ کے دام وصول کرنے کا طریقہ سب سے مختلف تھا۔ جب وہ کہانی سنا رہا ہوتا اور کہانی میں کوئی زوردار مقام آتا تو لوگ بے اختیار واہ واہ کہہ اُٹھتے۔ اسی وقت داستان گو کا ایک اپنا آدمی آبنوس کی لکڑی کا بنا ہوا صندوقچہ لے کر مہمانوں میں آجاتا۔ وہ ہر آدمی کے قریب سے ہو کر گذرتا۔ اس وقت ہر سامع پر فرض ہوتا کہ وہ اس صندوقچے میں کچھ نہ کچھ ڈالے۔ اور ایسا ہی ہوتا۔ کہانی میں زوردار مقام کئی بار آتا اور ہر بار صندوقچے میں سکّے جمع ہوتے۔

## موہنجو داڑو کا گمنام داستان گو

جیمز پال سٹون نے اس عجوبہ روزگار داستان گو کا نام نہیں لکھا۔ اُس نے اس بات پر بھی بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ انتہائی تحقیق کے باوجود اُسے داستان گو کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ اُس کا نام مٹ گیا لیکن اس کی سنائی ہوئی کہانیاں باقی رہ گئیں۔ یہ ساری چار کہانیاں ہیں ان میں سے تین غیر مکمل ہیں اور ایک مکمل ہے۔ ان کہانیوں کے عنوان نہیں دیئے گئے۔ بس کہانی شروع ہوتی ہے اور پھر اپنے نقطۂ عروج سے ہوتی ہوئی ایک مقام پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ غیر مکمل تین کہانیوں کے موضوع عشق و محبت اور دیوتا دیویوں کی رقابت اور انتقام ہیں۔ یہ دیوتا بابل و نینوا کی تہذیب کے دیوتاؤں سے بہت مماثلت رکھتے ہیں۔ ان میں سب سے انوکھا اور دلچسپ کردار اس دیوتا کا ہے جو دریا کا دیوتا ہے۔ یہ دیوتا اپنے طور پر انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ ہمیں بابل و نینوا اور دریائے نیل کی تہذیب میں ایسے کسی دیوتا کا سراغ نہیں ملتا۔ دریاؤں کی دیویاں ضرور ہیں جنہیں خوش کرنے کے لئے بعض ادوار میں حسین لڑکیوں کی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ موہنجو داڑو میں دریائے سندھ ہی سب سے بڑا دریا تھا اور اسی دریا کی مناسبت سے اس تہذیب نے اپنے عروج کا عہد استوار کیا۔

موہنجو داڑو کے اس عظیم اور گمنام داستان گو کی تینوں کہانیوں میں قریباً تمام دیوی دیوتاؤں کے کردار اپنے اپنے دائرہ عمل میں ہمیں نظر آتے ہیں۔ صرف چوتھی کہانی ایک ایسی کہانی ہے جس میں ہمیں دریا کے دیوتا کا کردار ملتا ہے۔ یہ کردار اس کی پہلی تین غیر مکمل کہانیوں میں نہیں ہے۔ اس دیوتا کا نام اُشر بیان کیا گیا ہے۔ اب ہم موہنجو داڑو کے اس گمنام داستان گو کی چوتھی اور نایاب کہانی کو آپ کے لئے تحریر کرتے ہیں۔ اس خیال سے کہ یہ کہانی بھی اُردو ادب کی تاریخ میں مدوّن ہو جائے۔ کیونکہ کم از کم اردو داستانوں کی تاریخ میں میں نے موہنجو داڑو کی کوئی کہانی نہیں دیکھی۔ اس کہانی میں ہمیں کردار بدلتے ملیں گے لیکن واقعات کے پیچھے وہی جذبات کارفرما نظر آئیں گے جو آج بھی ہماری رگ و پے میں جاری و ساری ہیں۔ اس کہانی کا نام کوئی نہیں ہے۔ لیکن جیمز پال سٹون نے لکھا ہے کہ ساری کہانی پڑھ کر ہم اس کہانی کا نام "دیوتا اُشر کا انتقام" رکھ سکتے ہیں۔ کہانی یوں بیان کی گئی ہے۔

## دیوتا اُشر کا انتقام

بادل آسمان پر آئے۔ ہوائیں آئیں۔ آندھیاں چلیں۔ بجلی چمکی اور کھیت جل گیا۔ غریب کسان کا نقصان ہوا۔

طوفان آیا۔ سیلاب آیا۔ فصل بہہ گئی۔ غریب کسان کا نقصان ہوا۔ اور دیوتا اُشر نے اپنا بدلہ پورا کر لیا۔ اے دیوتا اُشر! تو چاندی ایسے دریا، چمکتی لہروں اور زرخیز کھیتوں کا دیوتا ہے۔ تو ہمارے لئے اناج مہیا کرتا ہے اور ہمارے بچوں کو کھانے کو دیتا ہے۔ ہم پر رحم کر اور ہماری کھیتوں کی حفاظت کر ـــــ میں اس شہر کا سب سے بڑا داستان گو۔ میں اس ملک کا سب سے بڑا داستان گو تیری عظمت کے گیت گا کر اس کہانی کا آغاز کرتا ہوں۔ میں تیری عظمت کے گیت سننے والوں کو اس شخص کے عبرت ناک انجام سے باخبر کرنا چاہتا ہوں جس نے تیری عظمت کو نیچا دکھانا چاہا اور خود تیرے انتقام کی آگ میں جل گیا ـــــ "

اس دلچسپ کہانی کا آغاز گمنام داستان گو ان الفاظ میں کرتا ہے۔ یہ الفاظ مجھے آج بھی زبانی یاد ہیں اور میں نے جیمز پال سٹن کی کتاب میں لکھے ہوئے انگریزی الفاظ کا ترجمہ کر دیا ہے۔ باقی کہانی میں مختصراً اپنے الفاظ میں بیان کروں گا۔ کیونکہ وہ کتاب ڈھاکہ کی لائبریری میں پڑی ہے اور مجھے کہانی کے سارے الفاظ یاد نہیں رہے ہاں اس کا پلاٹ، کردار، نقطۂ عروج اور انجام ضرور یاد رہ گیا ہے۔

داستان گو اپنی داستان کا آغاز ایک متبرک مندر سے کرتا ہے جہاں جشن کی رات ہے۔ دیوتا کے بہت بڑے بُت کے سامنے اس کی پوجا کی رات ہے۔ یہ دَور شاید داستان گو کے اپنے زمانے سے بھی بہت پہلے کا دَور ہے۔ مندر میں بادشاہ اپنی ملکہ اور اُمرائے دربار کے ساتھ موجود ہے اور دیوتا کے حضور سر بسجود ہے۔ سنکھ بجائے جا رہے ہیں۔ ڈھول پیٹے جا رہے ہیں۔ دیوداسیاں رنگ برنگ لباس پہنے، سیاہ بال کھولے دیوتا کے سامنے رقص کر رہی ہیں۔ یہ مندر دریا کے کنارے پر ہے اور اس میں دریا کے دیوتا مقدس اُشر کا بہت بڑا بُت نصب ہے جو سونے کا ہے۔ مقدس اُشر دیوتا کی منظورِ نظر دیوداسی اوہنی بھی مندر میں رقص کر رہی ہے۔ اوہنی کی آنکھیں بادام ایسی ہیں۔ اس کا چہرہ چاند کی مانند چمک رہا ہے۔ صندلیں جسم پر سیاہ زلفیں سانپوں کی طرح پیچ و خم کھا رہی ہیں۔ اس کے گدرائے ہوئے کنوارے جسم سے دریا کنارے اُگے پھولوں کی مہک اٹھ رہی ہے۔ اس نے اپنے کانوں میں مقدس دیوتا کے پسندیدہ پھول سفید کنول پہن رکھے ہیں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مقدس اُشر نے اپنی منظورِ نظر محبوبہ اوہنی سے بیاہ رچا رکھا ہے۔ وہ مندر میں ہی دیوتا کے قدموں میں زندگی بسر کر رہی ہے۔

اوہنی ناچ رہی ہے۔ اس کے اردگرد دوسری دیوداسیاں بھی رقص کر رہی ہیں۔ مقدس دیوتا اُشر کا بُت یہ ناچ دیکھ رہا ہے۔ سارے لوگ منہ ہی منہ میں مقدس اشلوک پڑھ رہے ہیں۔ بادشاہ اس کی ملکہ اور درباری امراء سب کے سب باادب کھڑے ہیں۔ کسی کو مجال نہیں کہ وہ کسی سے بات کر سکے۔ اب ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ملک بابل کا ایک شہزادہ اندر داخل ہوتا ہے۔ شہزادہ موہنجو داڑو کے بادشاہ کا مہمان بن کر اس کے محل میں اترا ہوا ہے۔ بادشاہ اُسے مقدس رسم میں اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ پھرتا پھراتا مندر میں آن نکلا۔ بادشاہ، ملکہ، درباریوں اور دوسرے لوگوں نے شہزادے کو دیکھا اور خاموش رہے۔ شہزادہ بھی مندر کی مقدس فضا سے مرعوب ہو کر ایک ستون کے پاس کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے اشارے سے اُسے اپنے پیچھے آ کر کھڑے ہونے کو کہا۔ شہزادہ وہاں سے چل کر بادشاہ کے تخت کے عقب میں آ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اب اس نے مندر کا جائزہ لیا۔ اس نے دیوداسیوں کے ہجوم میں حسین ترین دیوداسی اوہنی کو رقص کرتے دیکھا تو اس کے دل پر گویا بجلی سی گری۔ وہ اس دیوداسی پہ دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ اوہنی کا صندلیں بدن ایک شعلہ تھا جس نے شہزادے کی عقل و خرد کو جلا کر بھسم کر دیا۔ اوہنی کے حسن و جوانی نے اس پہ سقدر اثر کیا کہ وہ اپنے ہوش و حواس بھی کھو بیٹھا۔ وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھا اور رقص کرنے والی دیوداسیوں میں آ کر اس نے اوہنی کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔

اس حرکت سے وہاں ایک ہیبت سی طاری ہو گئی۔ ہر کوئی دم بخود ہو کر رہ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس اجنبی شہزادے کو تکنے لگا۔ پجاری کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس سے بڑھ کر مقدس دیوتا اُشر کی اور کیا توہین ہو سکتی تھی کہ کوئی غیر شخص سب کے سامنے اس کی محبوبہ اور بیوی کا ہاتھ چوم لے۔ بادشاہ بھی اپنی جگہ پر لرز گیا۔ اُسے یقین تھا کہ ابھی اس شہزادے پر دیوتا اُشر کا عذاب نازل ہو گا۔ پجاری نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے۔ دیوداسیوں کا رقص رُک گیا۔ وہاں ایک گمبھیر خاموشی چھا گئی۔ اوہنی خالی خالی نظروں سے کبھی پجاری، کبھی بادشاہ اور کبھی شہزادے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اگرچہ اس کا قصور کچھ نہ تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ دیوتا اُشر کا اس پر بھی عذاب ضرور نازل ہو گا۔ سب لوگ دیوتا اُشر کے سونے کے عظیم بُت کو دیکھ رہے تھے کہ ابھی اس کی آنکھوں سے بجلی کا شعلہ نکلے گا اور شہزادے کو بھسم کر کے رکھ دے گا۔ اس وقت مندر سے باہر آسمان پر گھنے بادل چھا رہے تھے۔ باہر بادل بڑے زور سے گرجا۔ لوگوں کے دل دہل گئے۔ اوہنی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ دوسرے پجاری اُسے اٹھا کر مندر کی ایک کوٹھڑی میں لے گئے۔ شہزادہ بھی ہکا بکا اپنی جگہ پر کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا۔ اس سے ایک غیر شائستہ حرکت سرزد ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ اس نے وفورِ محبت سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ شاید اب وہ اپنے کئے پر پچھتا رہا تھا۔ لیکن اب پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ پجاری نے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ بادشاہ نے سر جھکا دیا اور پھر ایک ہاتھ اپنے سر کے اوپر بلند کر کے کچھ اشارہ کیا۔ اس اشارے کے ساتھ ہی چھ سات ہٹے کٹے پجاری آگے بڑھے اور انہوں نے پلک جھپکنے میں شہزادے کو رسیوں سے جکڑا اور اٹھا کر لے گئے۔ اُس کے جاتے ہی پجاری نے ہاتھ بلند کیا اور مقدس رسومات کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ لوگ اونچی آوازوں میں اشلوک اور منتر پڑھنے لگے اور دیوداسیوں نے رقص شروع کر دیا۔

پوجا کی رسم ختم ہو گئی۔ لوگ ادب سے سر جھکائے مندر سے باہر جانے لگے۔ پجاری نے بادشاہ کے تخت کے پاس آ کر جھک کر سلام کیا اور کہا۔

"اے راجاؤں کے راجا! تمہارے مہمان شہزادے نے سب کے سامنے مقدس دیوتا اُشر کی مقدس بیوی کی توہین کی ہے۔ مجھے مقدس اُشر نے حکم دیا ہے کہ اس گستاخ شہزادے کو اس خوفناک گستاخی کی پوری پوری سزا دی جائے۔ دو راتوں کے بعد چاند کو گرہن لگنے والا ہے۔ دیوتا اُشر نے مجھے حکم دیا ہے کہ گرہن کی رات کو اس گستاخ شہزادے کو اس کے استھان کے آگے ذبح کر کے اس کا دل چیر کر اُسے پیش کیا جائے۔"

بادشاہ اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گیا۔ شہزادہ بابل کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس نے ایک ایسی حرکت کی تھی کہ اس کے مقابلے میں بابل کے شاہی خاندان سے خوشگوار تعلقات کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ بادشاہ خود دیوتا اُشر کا بہت بڑا پجاری تھا۔ اس نے یہ گوارا کر لیا تھا کہ بے شک شہزادے کی موت کے بعد بابل کے شاہی خاندان سے اس کی جنگ ہو جائے لیکن وہ دیوتا اُشر کا حکم ضرور بجا لائے گا۔ اُس نے سر جھکا کر دیوتا اُشر کے آگے تعظیم کی اور پجاری سے کہا۔

"شاہی پجاری! تمہیں اختیار ہے کہ دیوتا اُشر کے حکم کے مطابق ہمارے مہمان کو گرہن کی رات مقدس دیوتا کے استھان پہ قربان کر دو اور اس کا دل نکال کر

مقدس اُشتر کی خدمت میں پیش کرو۔"

پجاری نے اپنی لال لال آنکھوں سے بادشاہ کو گھور کر کہا۔

"اے بادشاہ! تمہیں اپنے فیصلے پر قائم رہنا ہوگا۔ اگر تم کسی وجہ سے پھر گئے تو مقدس اُشتر اپنی طوفانی لہروں میں تمہارے محل کو، اس سارے شہر کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گا۔ بابل کا بادشاہ ہو سکتا ہے تم پر چڑھائی کر دے۔ لیکن تمہیں مقدس اُشتر کی خاطر اُس سے جنگ کرنی ہوگی۔ دیوتا اُشتر تمہیں فتح عطا کرے گا۔"

بادشاہ نے کہا۔

"مقدس پجاری! مقدس دیوتا اُشتر کی عظمت اور حرمت مجھے اپنی سلطنت اور اپنے خاندان کی زندگی سے بھی بڑھ کر عزیز ہے۔ میں بابل کی فوجوں کا مقابلہ کروں گا اور ان سے لڑتا لڑتا اپنے بیوی بچوں سمیت جان دے دوں گا لیکن مقدس اُشتر کی توہین کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ اس بدبخت شہزادے کی قربانی گرہن کی رات کو ضرور ہوگی اس کی تیاری شروع کرو تاکہ مقدس اُشتر کی تمنا اور حکم جلدی سے جلدی بجا لایا جائے۔"

بادشاہ کے اس اعلان کے ساتھ ہی مندر میں پجاریوں نے چیخ چیخ کر خوشی کے نعرے لگائے۔ دیوداسیوں نے دیوانہ وار رقص شروع کر دیا۔ بڑے پجاری نے ایک مشعل روشن کی اور اسے ہاتھ میں لے کر مقدس اُشتر کے بُت کے آگے جا کر اسے استھان پر لگا دیا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مقدس اُشتر! تمہارا حکم پورا ہوگا۔ تمہارے دشمن کو برباد کر دیا جائے گا۔ تمہاری توہین کرنے والے کا خون دو راتوں بعد تمہاری مرضی کے مطابق، تمہارے حکم کے مطابق تمہارے قدموں میں بہہ رہا ہوگا اور اس کا دھڑکتا ہوا دِل اُس کے سینے سے نوچ کر تمہارے پاؤں پر رکھ دیا جائیگا۔ فتح ہو مقدس اُشتر کی۔ فتح ہو مقدس اُشتر کی۔"

مندر میں موجود سب لوگوں نے "فتح ہو" "فتح ہو" کے نعرے بلند کئے۔ بادشاہ نے اپنی ملکہ اور امرا کو ساتھ لیا اور شاہی جلوس کی شکل میں مندر کے بڑے دروازے سے نکل کر باہر آ گیا۔ یہ شاہی جلوس شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ مندر میں صرف پجاری اور دیوداسیاں رہ گئیں۔ بڑے پجاری نے بُت کے آگے سجدہ کیا۔ اپنی گول ٹنڈ پر ہاتھ پھیر کر تین بار کوئی اشلوک پڑھا اور پھر آنکھیں کھول کر دیوداسیوں سے کہا کہ وہ سب اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں جا کر آرام کریں، اور جب تک اُن کا حکم نہ ہو باہر نہ نکلیں۔ دوسرے پجاری بھی اُن دیوداسیوں کے ساتھ ہی کوٹھڑیوں میں چلے گئے۔ بڑا پجاری اپنے ایک نائب کو ساتھ لے کر اس کوٹھڑی کی طرف چل پڑا جہاں شہزادہ قید تھا۔

## آدھی رات کو ملاقات

شہزادے کو ایک کال کوٹھڑی میں لا کر ڈال دیا گیا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ پُشت پر رسیوں سے بندھے تھے۔ کوٹھڑی میں اسے ایک ستون کے ساتھ زنجیر سے باندھا گیا اور دونوں ہاتھ کھول دیئے گئے۔ پجاری اپنے منتری کے ساتھ کوٹھڑی میں داخل ہوا تو شہزادہ سر جھکائے ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ یہ شہزادہ بے حد خوبصورت تھا اور مردانہ حُسن و جمال کا مثالی نمونہ ——— یہ اس کے اسی مردانہ حُسن و جمال کا ہی اثر تھا کہ اور بھی ایسی تنک مزاج اور دیوتاؤں کی منظورِ نظر دیوداسی نے بھی اپنے اندر اس کے ہاتھ کو جھٹک دینے کی جرأت نہ پائی تھی۔ بڑے پجاری اور اس کے منتری کو داخل ہوتے دیکھ کر شہزادے نے کوئی بات نہ کی اور نہ اٹھ کر اس کی تعظیم بجا لایا۔ آخر وہ ایک ملک کا شہزادہ تھا اور شاہی خاندان کا فرد تھا۔ پجاری نے اندر آتے ہی ایک حقارت بھری نظر شہزادے پر ڈالی اور اُس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے ہمارے مقدس دیوتا کی مقدس بیوی کے ساتھ کس قدر بھیانک گستاخی کی ہے؟"

اصل میں شہزادے سے ملاقات کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا سوائے اس کے کہ یہ کمینہ خصلت پجاری اپنی انا کو تسکین پہنچانا چاہتا تھا اور شہزادے کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کرنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ شہزادے نے پجاری کے سوال کو سن کر اپنا سر اٹھایا اور بڑی شان اور فخر سے بولا۔

"میں نے جو کچھ کیا وہی کیا جو ایک ایسے شہزادے کو کرنا چاہیئے تھا جو کسی حسین نوجوان لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے۔"

اس جواب نے پجاری کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اُسے شہزادے سے اس قسم کے جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ شہزادہ اٹھ کر اس سے معافی مانگے گا اور اس کے آگے گڑگڑائے گا۔ لیکن یہاں اس نے پجاری کو پرکاہ کی بھی وقعت نہ دی تھی۔ اسکے باوجود پجاری کے ترکش میں ابھی ایک اور تیر باقی تھا۔ اور یہ تیر اس شہزادے کی موت کا پروانہ تھا۔ جس پر بادشاہ کی مہرِ تصدیق ثبت ہو چکی تھی۔ اُس نے گردن کو سانپ کی طرح آگے پیچھے ہلا کر کہا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تم ہمارے سب سے بڑے دیوتا اُشتر کی بے عزتی کا باعث بن رہے ہو اور اس کی سب سے بڑی اور سب سے مقبول نظر چہیتی بیوی کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہو؟"

شہزادے نے بڑی شان سے گردن اٹھا کر کہا۔

"میں نے جو کچھ کیا ہے میں اُس کے بارے میں نہ تو پشیمان ہوں اور نہ اس سلسلے میں کسی سے معافی کا طلب گار ہوں۔ تم لوگوں نے ایک مہمان شہزادے کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بھی کوئی قابلِ تعریف فعل نہیں ہے۔ میرے ماں باپ کو جب اس خبر ہوگی تو انہیں بہت دکھ ہوگا۔"

بڑے پجاری نے نفرت سے سر کو ایک طرف جھکا کر کہا۔

"ہمارے مقدس دیوتا اُشتر کے آگے تمہارے ماں باپ کی حیثیت ہی کیا ہے۔ ہم اُن کو ذرا سی بھی وقعت نہیں دیتے۔ باقی رہا تمہارے ماں باپ کا مسئلہ تو انہیں اس سے زیادہ صدمے کی خبر پہنچے گی۔"

اس بات پر شہزادے نے ذرا سا چونک کر پجاری کی طرف دیکھا۔ اس نے دِل میں خیال کیا کہ شاید ان لوگوں نے اُسے ہمیشہ کے لئے جیل میں قید رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اُس نے پجاری سے کہا۔

"کھل کر بات کرو پجاری! تمہارے دل میں کیا ہے؟"

پجاری نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"آج سے ٹھیک دو راتوں کے بعد تمہیں دیوتا اُشتر کے قدموں میں ہلاک کر کے تمہارے دل کو دیوتا کے قدموں میں نچھاور کیا جائے گا۔ یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے اور بادشاہ نے اس فیصلے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔"

شہزادہ ایک بار تو بے حد حیران ہوا۔ اُسے بادشاہ سے ایسے سلوک کی توقع نہیں تھی۔ وہ اس کے باپ کا دوست تھا۔ وہ بابل کی ایک ریاست کے سربراہ کی دشمنی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں لوگ دوستیوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ پجاری نے ایک مکروہ قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہمارا راجہ ایک بہت بڑی سلطنت کا راجہ ہے۔ تمہارے باپ کا راج بابل کے ایک چھوٹے سے شہر پر ہے۔ وہ تمہارے باپ کو کیا سمجھتا ہے۔ اور پھر ہمارا راجہ مقدس دیوتا اُشتر کا چیلا ہے۔ وہ اپنے گورو اور اپنے دیوتا کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہاری قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ آج سے ٹھیک چودہ راتوں کے بعد چاند گرہن ہوگا۔ اسی رات جب کہ چاند کو گرہن کے ہالے نے گھیر لیا ہوگا تمہارے سینے میں مقدس دیوتا اُشتر کا مقدس خنجر اُتار دیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر بڑا پجاری اپنے منتری کے ساتھ کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔ پہریدار نے کوٹھڑی بند کر کے باہر سے تالا ڈال دیا۔ شہزادہ پریشان ہو گیا۔ اس کی پریشانی بجا تھی۔ وہ پردیس میں مہمان بن کر آیا ہوا تھا۔ اپنے گھر سے سیکڑوں، ہزاروں فرسنگ کے فاصلے پر تھا۔ بار بار اس کے ذہن میں خیال آتا کہ راجہ نے یہ کیونکر گوارا کر لیا۔ وہ اس کے باپ کے آگے کیا عذر پیش کرے گا۔ بہرحال اب جو کچھ بھی ہوگا اور جو کچھ بھی ہونے والا تھا ہو کر رہے گا۔ یہ کمینہ خصلت پجاری اُس کا دشمن بن گیا ہے۔ اسی نے راجہ کو بھڑکایا ہوگا اور وہ میرے قتل پر آمادہ ہو گیا۔ شہزادے کے دماغ نے تیزی سے سوچنا شروع کر دیا۔ وقت بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔ اُسے بے بسی کی موت مرنا ہرگز ہرگز گوارا نہ تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ یہاں سے فرار ہو کر رہے گا۔

اُدھر پجاری سیدھا اس کوٹھڑی میں گیا جس میں مقدس دیوتا اُشتر کی منظورِ نظر محبوبہ اور بیوی رودہنی بند تھی۔ ادہنی کے پاؤں میں بھی چاندی کی زنجیر بندھی تھی اور وہ ایک ستون سے ساتھ لگ کر ہرن کی کھال پر بیٹھی تھی۔ پجاری کو اندر آتا دیکھ کر اس نے سر جھکا دیا۔ پجاری اس کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ ادہنی نے غمزدہ آواز میں پوچھا۔

"مقدس پجاری! مجھے کس جرم میں قید میں ڈالا گیا ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں بےقصور ہوں۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ شہزادے نے بھری محفل میں اگر میرا ہاتھ چوم لیا۔ میں کیا کر سکتی تھی؟"

پجاری نے غصے میں کہا۔

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم خاموش رہیں۔ تمہارا گناہ یہ ہے کہ تم نے ایک ایسے گستاخ کے ہاتھ کو جھٹکا تک نہیں جس نے مقدس اُشتر کی منظورِ نظر محبوبہ کو چومنے اور گلے سے لگانے کی کوشش کی تھی۔ دیوتا اُشتر کے حکم سے ہی تمہیں قید میں ڈالا گیا ہے۔ تمہیں بھی سزا ضرور ملے گی۔"

ادہنی نے اُٹھ کر پجاری کے پاؤں پکڑ لئے۔

"مجھ پر رحم کیا جائے۔ دیوتا اُشتر کے نام پہ مجھ پر رحم کیا جائے میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ میں شہزادے کی حرکت پر دم بخود ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھ پر اس کی حرکت نے گویا جادو کر دیا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ رہی تھی کہ میں اُس کے ہاتھ کو جھٹک سکتی۔"

"بکواس بند کرو گستاخ دیوداسی!" پجاری نے چیخ کر کہا۔ "تم یہ کہہ کر کہ شہزادے نے تم پر جادو کر دیا تھا اس بات کا اعتراف کر رہی ہو کہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے۔ خبردار اگر اب ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو دیوتا اُشتر کا قہر تم پر آسمانی بجلی بن کر نازل ہوگا۔"

ادہنی نے پوچھا۔ "کیا دیوتا اُشتر نے میرے قتل کا حکم صادر کیا ہے؟"

پجاری بولا۔ "ابھی اس بارے میں فیصلہ نہیں ہوا۔ دیوتا اُشتر تمہارے بارے میں جو فیصلہ کرے گا ہمیں اس پر ضرور عمل کرنا ہوگا۔ ابھی تو صرف شہزادے کے بارے میں حکم ہوا ہے کہ اُسے آج سے چودھویں رات پورے گرہن میں دیوتا کے استھان کے آگے ہلاک کر دیا جائے۔"

"نہیں نہیں ایسا نہ کرنا۔ وہ بے گناہ ہے۔"

"خاموش گستاخ! بے ادب! تم دیوتاؤں کے مجرم کی حمایت کر کے اپنے آپ کو مجرم ثابت کر رہی ہو۔ اپنے الفاظ واپس لو نہیں تو اس کے ساتھ تمہیں بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔"

رودہنی نے جلدی سے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں عظیم پجاری!"

پجاری غصّے کی حالت میں پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ پہریدار نے دروازہ بند کر کے اس پر تالا ڈال دیا۔ ادہنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ سوچ کر کہ ایک حسین اور نوجوان شہزادے کو صرف اس لئے ہلاک کیا جا رہا ہے کہ وہ اس کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اس کا ہاتھ چوم بیٹھا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ دیوداسی ادہنی کو شہزادے کی یہ ادا بھا گئی تھی اور وہ ہزار جان سے اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ لیکن اپنے اس راز کو وہ کسی پر ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اس خیال کو اپنے دل کی گہرائیوں میں ہی دفن کر رکھا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ بدبخت کمینہ پجاری اس فیصلے پر عمل کر کے رہے گا۔ دیوتا اُشتر کی وہ منظورِ نظر اس لئے تھی کہ اُسے پجاری نے ایسا یقین دلا رکھا تھا کہ دیوتا اُشتر نے اس سے شادی کر رکھی ہے اور وہ خود دیوتا کا اوتار ہے۔ اس کا نمونہ ہے۔ چنانچہ وہ خود ادہنی سے پیار کرتا تھا۔ دیوتا اُشتر نے کبھی ادہنی سے ملاقات نہ کی تھی اور کبھی وہ اس کے پاس آ کر رات نہ رہا تھا۔ ادہنی دیوتا اُشتر کا احترام کرتی تھی۔ اُس کی پوجا کرتی تھی جس طرح کہ دوسری عورتیں اُس مقدس دیوتا کی پوجا کرتی تھیں۔ لیکن وہ اسے اپنا خاوند کیسے مان سکتی تھی جب کہ اس نے کبھی اپنی سونے کی بانہیں ادہنی کے گلے میں ڈال کر اُس کے ہونٹوں کو نہیں چوما تھا۔ جب کہ اُس نے کبھی اس کے بطن سے بچہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ہاں یہ کوشش ایک دو بار یہ کمینہ پجاری ضرور کر چکا تھا جس میں وہ ادہنی کی وجہ سے ناکام رہا تھا۔ ادہنی نے پجاری کو کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے اس کے ساتھ زنا بالجبر کرنے کی کوشش کی تو وہ مندر کے سب سے بلند مینار کے اوپر کھڑے ہو کر اعلان کر دے گی کہ پجاری نے دیوتا اُشتر کی بیوی سے زنا بالجبر کیا ہے۔ پجاری کو یہ بدنامی ہرگز گوارا نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ادہنی کا دشمن بن گیا تھا۔ لیکن وہ اسے موت کی سزا بھی نہیں دینا چاہتا تھا اس لئے کہ وہ خود اس کے جسم کا عاشق تھا اور اُسے کبھی نہ کبھی حاصل کرنے کی تمنا رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے ادہنی کو شہزادے کے ساتھ ہی موت کے گھاٹ اُتارنے کی سفارش راجہ سے نہیں کی تھی ___ ادہنی کو اس وقت اپنی سہیلی الکندہ کا خیال آیا۔

الکندہ بھی ایک دیوداسی تھی اور ادہنی کی وہ بہت گہری سہیلی تھی۔ وہ اس کی رازدار بھی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ پجاری کی ادہنی پر بُری نظر ہے اور وہ دیوتا اُشتر کے نام کا بہانہ بنا کر ادہنی کو خود حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ ادہنی سے بہت پیار کرتی تھی۔ ادہنی نے سوچا کہ کسی طرح سے اُس کو بُلا کر مشورہ کیا جائے تاکہ شہزادہ بے گناہی کی موت سے بچ سکے۔ ادہنی کو اس بات کا بڑا صدمہ تھا کہ ایک بے گناہ اور حسین نوجوان شہزادہ محض اس سے محبت کرنے کے جرم میں ہلاک کیا جا رہا ہے۔ رات کافی گذر گئی تھی۔ شہر پر سناٹا طاری تھا۔ مندر میں بھی خاموشی چھا چکی تھی۔ پجاری اپنے منتری کے ساتھ جا چکا تھا۔ ادہنی ہرن کی کھال پر لیٹ گئی۔ اور انہی خیالات میں غوطہ زن سو گئی۔ دن چڑھا تو ایک

پہریدار پجاری اسس کے لئے دودھ لے کر آیا۔ اس نے پجاری سے التجا کی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے اس کی سہیلی الکنندہ کو بلا دے۔ پہریدار راضی نہ ہوا۔ پر اوہنی نے اُسے کچھ ایسے حسین اور دلنشیں انداز میں التجا کی کہ وہ حامی بھر بیٹھا۔ دوپہر کا کھانا لے کر الکنندہ اسس کے پاس آگئی۔ اس نے آتے ہی دروازہ بند کر دیا اور کہا کہ وہ بڑی مشکل سے تھوڑا سا وقت لے کر آئی ہے۔ اوہنی نے اُسے ساری کہانی بیان کر دی۔ اور کہا کہ وہ شہزادے کی جان بچانا چاہتی ہے۔ اس نے الکنندہ کو یہ بھی کہہ دیا کہ وہ شہزادے سے محبت کرنے لگی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس شہر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فرار ہو جانا چاہتی ہے۔ الکنندہ نے کہا۔

"پیاری سہیلی اوہنی! پہلے تمہیں یہ تو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ وہ شہزادہ بھی تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہے؟ کیا وہ بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی محبت کہ تم اس سے کرتی ہو؟"

اوہنی نے کہا۔ "اس کا پتا تم لگاؤ گی۔"

الکنندہ نے وعدہ کیا کہ وہ شہزادے کے پاس جا کر اسکے دل کا حال معلوم کرے گی اور اگر وہ بھی تمہارے ساتھ فرار ہونے پر راضی ہوگیا تو پھر یہاں سے فرار ہونے کی ترکیب پر غور کیا جائے گا۔ الکنندہ تھوڑی دیر بعد چلی گئی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جو پجاری شہزادے کی کوٹھڑی کے باہر پہرہ دے رہے تھے وہ الکنندہ سے عشق کرتے تھے اور اسے حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس لئے الکنندہ کے لئے شہزادے سے ملاقات کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ لیکن پھر بھی اُسے پہریدار زیادہ چھوٹ نہ دے سکتے تھے کیونکہ شہزادہ دیوتا اُشر کا مجرم تھا اور اُسے دیوتا کے حضور میں ہلاک کیا جانے والا تھا۔ یہ تمام باتیں ذہن میں رکھتے ہوئے الکنندہ نے اسی رات پہریداروں سے اجازت لے لی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے شہزادے سے ملنا چاہتی ہے۔ پہریداروں نے یہ سوچ کر اجازت دے دی کہ آخر وہ شہزادے کو قمیض کے اندر تو چھپا کر نہیں لے جائے گی۔ اتنا انہوں نے الکنندہ کو ضرور کہا کہ وہ زیادہ دیر شہزادے کے پاس نہ بیٹھے۔ کیونکہ اگر دوسرے پجاریوں کو اس بات کا علم ہوگیا تو ان کی جان پر مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔

الکنندہ بڑی ہوشیار اور چلتا پرزہ دیوداسی تھی۔ اس نے چٹکیوں میں دونوں پہریداروں کو ایک ایک بوسہ دے کر رام کر لیا اور سیدھی شہزادے کی کوٹھڑی میں جا پہنچی۔ شہزادہ پریشان حال بیٹھا تھا۔ الکنندہ نے جاتے ہی باتوں ہی باتوں میں معلوم کر لیا کہ شہزادہ تو اوہنی کے عشق میں بُری طرح گرفتار ہے۔ اور اُس پہ ہزار جان سے عاشق ہے۔ اب الکنندہ نے شہزادے کو بھی یہ بتا دیا کہ اوہنی دیوداسی بھی اس سے محبت کرتی ہے اور اُسے اس کی موت کسی طرح سے بھی گوارا نہیں۔ وہ اسے موہنجو داڑو کے ظالم پجاری راجہ کے دیس سے نسے فرار کرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ شہزادے نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"الکنندہ! اب مجھے مرنا قبول ہے لیکن اوہنی کے بغیر زندگی گوارا نہیں۔ میں اگر فرار ہوں گا تو ایک ہی صورت میں کہ میری محبوبہ میرے ساتھ ہو۔ ورنہ اس کے بغیر زندگی موت سے بھی بدتر ہوگی۔"

یہ شہزادے نے یوں ہی اوہنی کا دل رکھنے کے لئے کہہ دیا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ اکیلا ہی فرار ہونے کو تیار تھا۔ لیکن اگر اسے یقین ہو جاتا کہ دیوداسی اوہنی بھی اس کے ساتھ بھاگ نکلنے کو تیار ہے تو وہ اسے اپنی سب سے بڑی خوش قسمتی سمجھ کر اسے گلے سے لگا کر وہاں سے فرار ہو جاتا۔ الکنندہ نے کہا۔

"دیوداسی اوہنی تمہارے ساتھ فرار ہونے کو تیار ہے۔ بلکہ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔"

شہزادہ بڑا خوش ہوا۔ اس نے الکنندہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"تم اوہنی کی سب سے پیاری سہیلی ہو! اوہنی کو جا کر کہہ دو کہ میں اس کی محبت کی آگ میں جل رہا ہوں۔ اگر وہ میرے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کو تیار ہے تو میں اپنی جان کی بازی لگا کر اُسے یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔"

الکنندہ نے کہا۔ "شہزادے! تم جذباتی باتیں کر رہے ہو۔ تم اگر جان کی بازی لگا کر یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرو گے تو اپنی جان گنوا بیٹھو گے۔ اس لئے کہ تمہارے آس پاس بڑا سخت پہرہ ہے اور تم ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار نہ ہو سکو گے۔"

شہزادے نے پوچھا۔ "تو پھر میں کس صورت میں اپنی محبوبہ کے ساتھ یہاں سے نکل سکتا ہوں؟ الکنندہ! کیا تم ہماری مدد کر سکتی ہو؟"

الکنندہ نے کہا۔ "میں کوشش کروں گی۔ اب میں جاتی ہوں۔ میں کل کسی وقت تمہارے پاس آؤں گی اور تمہیں اپنے منصوبے کے بارے میں مطلع کر دوں گی۔"

الکنندہ چلی گئی۔ شہزادہ اپنی محبوبہ دیوداسی اوہنی کی یاد میں گم ہوگیا۔ الکنندہ وہاں سیدھی اوہنی کے پاس پہنچی۔ اُسے جا کر اُس کے عاشق زار کا سارا حال بیان کیا۔ اوہنی یہ سن کر بہت خوش ہوئی کہ شہزادہ اس پہ ہزار جان سے عاشق ہے۔ اس نے کہا۔

"الکنندہ! اب یہاں زندگی بسر کرنا عبث ہے۔ یہ بات تم بھی جانتی ہو کہ دیوتا اشر نے کبھی مجھے کچھ نہیں کہا۔ میرے ساتھ جو بُرا سلوک بھی ہوا ہے وہ اس کمینے پجاری کی طرف سے ہوا ہے۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ دیوتا اُشر مجھ سے پیار کرتا ہے یا نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ یہ بدخصلت پجاری ہی میرا خاوند اور مجھے ورغلانے والا ہے اگرچہ میں نے اس کی ہوس کو کبھی پورا نہیں ہونے دیا۔ اب میری زندگی میں پہلی بار میرا محبوب بہار جاوداں لے کر آیا ہے تو میں اس گھناؤنی زندگی کو خیرباد کہہ کر محبت کی پُربہار زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ میں یہاں سے شہزادے کو لے کر بھاگ جاؤں۔ کیونکہ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو یہ لوگ اُسے ضرور ہلاک کر دیں گے۔ اور پھر میری زندگی میں کبھی بہار نہیں آئے گی۔ میں ہمیشہ کے لئے خزاں نصیب بن کر رہ جاؤں گی۔ اس سلسلے میں تمہاری مدد کی بہت ضرورت ہے کیا تم ہماری مدد کرو گی؟"

الکنندہ بولی۔ "اے میری سب سے پیاری سہیلی اوہنی! میری جان بھی تم پر نثار۔ میں تمہاری ضرور مدد کروں گی۔ تمہاری مدد کرتے ہوئے اگر مجھے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑا تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔"

اوہنی نے کہا۔ "دیوتا تمہاری زندگی کی حفاظت کریں۔ ہمیں ایسی حکمتِ عمل سے کام کرنا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ کوئی تم پر شک بھی نہ کر سکے اور ہم یہاں سے فرار بھی ہو جائیں۔ لیکن وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ وقت کہیں ہمیں دھوکہ نہ دے جائے۔ صرف آج کی رات بیچ میں ہے۔ اگر ہم نے آج کوئی منصوبہ بنا کر اس پہ عمل نہ کیا تو کل شہزادے پہ پہرہ سخت کر دیا جائے گا۔ پھر پہریدار بھی بدل جائیں گے اور تم ہمارے لئے کچھ نہ کر سکو گی کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟"

الکنندہ بولی۔ "پیاری اوہنی! تم ٹھیک سوچ رہی ہو۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے

وقت ہمیں دھوکہ دے سکتا ہے۔ لیکن ہم اُسے دھوکہ نہیں دینے دیں گی۔ میں ابھی جاکر تمہارے اور شہزادے کے فرار کی کوششیں شروع کر دیتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنی کوشش میں ضرور کامیاب ہوں گی۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔ میں شام کو آؤں گی۔"

الکندہ چلی گئی۔ اس نے اپنے منصوبے پر فوری عمل شروع کر دیا۔ وہ وہاں سے نکل کر سیدھی شہر کی فصیل سے باہر ایک پرانی کارواں سرائے کے ساتھ والی بستی میں گئی۔ اس بستی میں گھوڑوں کے سوداگر رہتے تھے۔ ایک سوداگر سے الکندہ کی دوستی تھی۔ یہ سوداگر دل کا بہت دلیر تھا اور محبت کرنے والوں کی مدد کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ الکندہ نے اس کو جاکر ساری کہانی صاف صاف کھول کر بیان کر دی۔ سوداگر کا جذبۂ محبت اور مہم جوئی بیدار ہو گیا۔ اُس نے کہا کہ وہ شہزادے اور اودہنی کے فرار میں ان کی پوری پوری مدد کرے گا۔ الکندہ نے کہا کہ اُسے زیادہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

"مجھے تمہاری صرف اتنی مدد چاہیے کہ تم دو گھوڑے جو بہترین اور برق رفتار ہوں کھانے پینے کے جھولے کے ساتھ تیار رکھنا۔ شہزادے اور اودہنی کو لے کر میں آج رات کسی وقت آؤں گی۔ وہ دونوں ان گھوڑوں پر سوار ہو کر یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔"

سوداگر نے کہا۔

"تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں دونوں گھوڑے سازوسامان سے لیس کر کے سرِ شام ہی تیار کر رکھوں گا۔ تم جس وقت رات کو دونوں محبت کرنے والوں کو لے کر آؤ گی تمہیں ہر شے تیار ملے گی۔"

"شکریہ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔"

الکندہ سوداگر سے بغلگیر ہو کر اس کا شکریہ ادا کر کے واپس مندر میں آگئی۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ مندر میں شام کی عبادت شروع ہونے والی تھی۔ الکندہ نے ابھی شہزادے کے پاس جاکر اُسے بھی تیار رہنے کا کہنا تھا اور ابھی اُس نے اس منصوبے کے سب سے اہم پہلو یعنی فرار پر بھی غور کرنا تھا۔ اُس نے یہی سوچ رکھا تھا کہ وہ اپنے عاشق پہریداروں سے اپنے جسم کا سودا کرے گی۔ دو محبت کرنے والوں کے لئے وہ اپنی جان اور عزت بھی قربان کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ وہ مندر میں داخل ہو گئی اور دیوتا اُشر کے بُت کے آگے جاکر سربسجود ہو گئی۔ اُس نے دل سے دعا مانگی کہ اے دیوتا اُشر! پجاری اودہنی پر ظلم کر رہا ہے وہ تمہارے حکم سے اپنے شہزادے سے پیار کرتی ہے۔ پجاری تمہارے نام پر اُس کے ساتھ ظلم کر رہا ہے۔ تمہیں دھوکہ دیتا رہا ہے۔ تم اب اس کی مدد کرنا اور پجاری سے ظلم کا بدلہ ضرور لینا۔ میں اودہنی اور اس کے محبوب کی مدد کر رہی ہوں۔ تم میری مدد کرنا۔

یہ دعا مانگ کر الکندہ سیدھی اس کوٹھڑی کے پاس آگئی جہاں شہزادہ قید تھا۔ یہاں دو پہرے دار پہرہ دے رہے تھے۔ الکندہ نے اپنی دل رُبا اداؤں سے دونوں پہریداروں کو بہت جلد رام کر لیا۔ اُس نے کہا۔

"دیکھو! اودہنی اور شہزادہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں جس طرح کہ تم دونوں مجھ سے محبت کرتے ہو۔ میری زندگی کی پہلی اور آخری خواہش یہ ہے کہ میں آج رات کسی وقت ان دونوں محبت کرنے والوں کی آپس میں ملاقات کرا دوں۔ اس کے لئے تمہاری امداد بہت ضروری ہے۔ کیا تم اس پر تیار ہو؟ اگر تم میرا یہ کام کر دو گے تو میں تم دونوں سے باری باری بیاہ کرنے پر تیار ہو جاؤں گی۔"

اگرچہ یہ کام بڑا خطرناک تھا مگر الکندہ ایسی حسین جسم والی دیوداسی سے بیاہ کرنے کے خیال نے ان دونوں پہرے داروں کو پاگل کر دیا۔ وہ ہر قسم کا خطرہ مول لینے پر تیار ہو گئے انہوں نے الکندہ سے کہا۔

"ہم تمہاری مدد پر تیار ہیں۔ لیکن تمہیں ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک ایک مہینہ شادی شدہ زندگی کا بسر کرنا ہوگا۔ کیا تمہیں منظور ہے؟"

الکندہ نے جھٹ کہا۔

"منظور ہے۔ میں دیوتاؤں کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں اس شرط پر دل و جان سے قائم رہوں گی۔"

ایک پہریدار نے کہا۔

"تم ان دونوں عاشق و معشوق کی ملاقات کس جگہ کرواؤ گی؟ کیا شہزادے کو اس کوٹھڑی سے کہیں دور جانا ہوگا؟"

الکندہ کہنے لگی "ہاں! میں نے اس مندر سے باہر ایک جگہ جو کہ بہت ہی خفیہ ہے ملاقات کا بندوبست کر رکھا ہے۔ اس جگہ یہ دونوں محبت کرنے والے اپنی زندگی کے آخری چند لمحے بسر کریں گے۔ اور ہم دونوں کو دعائیں دیں گے۔ شہزادے کو کل قربان کر دیا جائے گا۔ یہ اُس کی زندگی کی آخری ملاقات ہوگی جسے وہ اگلے جنم میں بھی یاد رکھے گا اور ہم سب کو دعائیں دے گا۔"

دوسرے پہریدار نے کہا۔

"مگر اودہنی کو وہاں سے کون نکالے گا؟"

الکندہ بولی "اس کا میں انتظام کر لوں گی۔ اب میں جاتی ہوں میں آدھی رات کو جب کہ مندر میں آخری پوجا بھی ہو چکی ہوگی آؤں گی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے شہزادے کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی اور پھر خود ہی واپس چھوڑ جاؤں گی۔ تم بے فکر رہنا۔ اب میں شہزادے سے مل لوں۔"

اتنا کہہ کر الکندہ وہاں سے کوٹھڑی کے اندر شہزادے کے پاس چلی گئی۔ اس نے شہزادے کے گوش گزار ساری بات کر دی۔ اُسے کہا کہ وہ آدھی رات کو بالکل تیار رہے۔ شہزادہ بہت خوش ہوا۔ یہاں سے الکندہ واپس اودہنی کے پاس آگئی۔ یہاں اس نے پہریدار سے بات کی اور اُس پر بھی اپنے حسن و شباب کا داؤ آزمایا۔ الکندہ کا جسم بھرپور شباب میں تھا۔ یہاں بھی پہریدار اُس کی بات مان گئے۔ لیکن انہوں نے شرط یہ پیش کی کہ اُن میں سے ایک پہریدار اُن کے ساتھ جائے ملاقات پر جائے گا۔ اس پر ایک پل کے لئے الکندہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر کے جھٹ ہامی بھر لی کہ وہ اس شرط کو تسلیم کرتی ہے۔

## داستان کا نقطۂ عروج

عاشق و معشوق کے ملاپ اور فرار کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اب کوئی رکاوٹ راستے میں نہیں تھی۔ الکندہ وقت کا انتظار کرنے لگی۔ رات کا پہلا پہر گزرا تو رات کی عبادت کا وقت آگیا۔ مندر میں عود لوبان سلگ اٹھے۔ آگ روشن ہو گئی اور پوجا کا رقص شروع ہو گیا۔ الکندہ بھی دوسری دیوداسیوں کے ساتھ دیوا اُشر کے بُت کے سامنے رقص کر رہی تھی۔ جب پوجا کا رقص ختم ہوا تو بڑے پجاری نے الکندہ کو اپنی کوٹھڑی میں بلا کر کہا۔

"الکندہ! اودہنی کے بعد تم ہی سب سے حسین دیوداسی ہو میں چاہتا ہوں کہ آج سے تمہیں وہ مقام دے دیا جائے جو اس سے پہلے اودہنی کے پاس تھا۔

"آج سے تم مندر کی مہا دیوداسی ہوگی۔ کیا تم خوش نہیں ہو؟"

الکنندہ نے خوش ہو کر کہا۔

"مہاراج! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس ناچیز دیوداسی کو اس لائق سمجھا۔"

پجاری نے آگے بڑھ کر الکنندہ کو اپنے سینے سے لگا کر پیار کیا اور اس کی گردن کو چومتے ہوئے بولا۔

"تم اس سے بھی اونچے مقام کے لائق ہو الکنندہ! جتنی محبت میں تم سے کرتا ہوں میں اوہنی سے بھی نہیں کرتا تھا۔ آج سے اوہنی کی جگہ تم میری بیوی ہو۔ کیا تمہیں میری بیوی بننا منظور ہے؟ یہ بات صرف تمہارے اور میرے درمیان ہوگی۔"

کسی دوسرے کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ الکنندہ مجبور تھی۔ اس نے کہہ دیا کہ اسے منظور ہے۔ اب تو پجاری کی باچھیں کھل گئیں۔ بہت خوش ہوا اور اسی وقت اس نے شب عروسی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ الکنندہ پریشان ہو گئی۔ اگر وہ پجاری کے ساتھ شب عروسی منانے بیٹھ جائے گی تو پھر شہزادے اور اوہنی کو اس جہنم سے فرار کون کرائے گا؟ شہزادہ تو کل رات ضرور قتل ہو جائے گا۔ اس نے بڑی محبت سے پجاری کے دل میں بانہیں ڈال کر کہا۔

"میرے پیارے خاوند! میرے مہاراج! اپنی دیوداسی کو صرف آج کی رات بخش دیں۔ کل رات میں آپ کے چرنوں میں ہوں گی۔"

پجاری نے وجہ پوچھی تو الکنندہ نے کوئی ایسی وجہ بتائی کہ پجاری مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں کل رات اپنے کمرے میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

الکنندہ پجاری کی کوٹھڑی سے نکلی تو اسے بے اختیار ہنسی آگئی کیونکہ بیک وقت پانچ آدمیوں سے بیاہ رچا رہی تھی۔ ایک بڑا پجاری۔ اور چار پہرے دار۔ لیکن وہ کیا چاہتی ہے؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ وہ مندر میں اپنی کوٹھڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔ پھر اٹھ کر اس نے تیاریاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اپنے لباس کے اندر ایک بہت تیز دھار خنجر اڑس لیا۔ وہ جو پہرے دار اس کے ساتھ جا رہا تھا اس کے بارے میں الکنندہ نے ضرورت پڑنے پر ایک بڑا خطرناک فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس کے بعد الکنندہ نے اپنے کندن ایسے بدن کو سیاہ کپڑوں میں ملبوس کیا۔ ماتھے پر تلک لگایا اور ٹھیک آدھی رات سے ایک پل پہلے اپنی کوٹھڑی سے نکل کر شہزادے کی کوٹھڑی کی طرف آگئی۔ مندر میں بہت کم روشنی ہو رہی تھی۔ راہداریوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ الکنندہ شہزادے کی کوٹھڑی کے باہر آئی تو پہریدار اس کا انتظار کر رہے تھے۔ تینوں نے باری باری اندھیرے کونے میں لے جا کر الکنندہ سے جی بھر کر پیار کیا اور پھر کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ شہزادے کو ساتھ لے کر الکنندہ جانے لگی تو پہرے دار نے کہا۔

"الکنندہ! میری بیوی! یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ شہزادے کی اوہنی دیوداسی سے ملاقات کرا کر اسے فوراً واپس لے آؤ۔"

الکنندہ نے پہرے دار کا منہ چوم کر کہا۔

"میرے پیارے خاوند! فکر کیوں کرتے ہو؟ کیا مجھے تمہاری زندگی عزیز نہیں ہے؟ کیا میں نے تمہارے ساتھ شادی شدہ زندگی کے دن نہیں گزارنے؟ تم بالکل نہ گھبراؤ۔ میں ایک گھڑی گزرنے کے بعد شہزادے کو لے کر تمہارے پاس موجود ہوں گی۔"

الکنندہ شہزادے کو ساتھ لے کر خوشی خوشی اندھیری راہداریوں سے ہوتی مندر کے عقبی دروازے سے باہر نکل گئی۔ یہاں ایک گھوڑا اس نے پہلے ہی سے باندھ رکھا تھا۔ اس نے خود گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے ساتھ شہزادے کو بھی سوار کروایا اور اسے لے کر شہر سے باہر کارواں سرائے کے ساتھ والی بستی میں سوداگر کے مکان کے صحن میں لے آئی۔ یہاں اس نے شہزادے کو سوداگر کے حوالے کیا جو ان کا انتظار کر رہا تھا اور خود اوہنی کو لینے واپس مندر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اوہنی کی کوٹھڑی کے باہر دونوں پہریدار پہرہ دے رہے تھے۔ الکنندہ نے باری باری ان کو بھی اپنی جھوٹی محبت کے جام پلائے اور اوہنی کو ساتھ لے کر کارواں سرائے کی طرف روانہ ہو گئی۔ کم بخت ایک پہریدار ان کے ساتھ ساتھ گھوڑے پر چلا آ رہا تھا۔ سوداگر کے مکان کے صحن میں آ کر الکنندہ اپنے گھوڑے سے اتر پڑی اور اس نے پہرے دار سے کہا۔

"تم بھی اپنے گھوڑے سے اتر کر یہاں حویلی کی ڈیوڑھی میں بیٹھ جاؤ اور انتظار کرو۔"

پہرے دار نے کہا

"میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکوں گا الکنندہ! تمہیں ان دونوں کو بہت جلد واپس کرنا ہوگا۔"

الکنندہ نے مسکرا کر کہا۔

"فکر کیوں کرتے ہو۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی مندر جاؤں گی۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لئے بھی ان دو محبت کرنے والوں کو ایک ساتھ نہ مل بیٹھنے دو گے۔"

یہ کہہ کر الکنندہ اوہنی کو لے کر حویلی کے اندر چلی گئی۔ اندر شہزادہ بے چینی سے اپنی محبوبہ کا انتظار کر رہا تھا۔ سوداگر بھی اسی جگہ پر موجود تھا۔ شہزادہ پہرے دار کو ساتھ آتا دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے الکنندہ سے کہا کہ پہرے دار کا کیا بنے گا؟ اس سے کیا چھٹکارا حاصل ہوگا؟ الکنندہ نے جواب دیا کہ وہ پہرے دار کو خود سنبھال لے گی۔ وہ اب فرار ہونے کی فکر کریں۔ حویلی کے عقبی دروازے سے گزر کر سوداگر اور الکنندہ دونوں محبت کرنے والوں کو پچھلے صحن میں لے گئی جہاں برق رفتار گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ شہزادہ اور اوہنی گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ الکنندہ نے باری باری دونوں کے ہاتھ چومے، پھر ہاتھ باندھ کر آخری سلام کیا۔ شہزادہ اور اوہنی صحن کے عقبی دروازے میں سے گزر کر رات کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ یہاں سے الکنندہ سیدھی باہر پہرے دار کے پاس آئی۔ اس نے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنی تو چونک کر پوچھا کہ یہ کون گیا ہے؟ اسے الکنندہ پر شک ہو گیا تھا۔ اب جو اس نے گھوڑوں کے بھاگنے کی آواز سنی تو الکنندہ کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے ہی الکنندہ اپنے اندرونی لباس میں سے خنجر نکال کر ہاتھ میں تھام چکی تھی۔ جونہی پہرے دار اس کی طرف بڑھا اس نے خنجر اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ لیکن وار اوچھا پڑا۔ پہرے دار نے تلوار نکال کر جوابی وار کر دیا۔ تلوار الکنندہ کی گردن پر پڑی اور اس کی گردن آدھی سے زیادہ کٹ کر لٹکنے لگی۔ وہ زمین پر گر پڑی۔ پہرے دار نے دوسرا وار کر کے اسے ختم کر دیا اور پھر تلوار سونت کر حویلی میں آیا۔

سوداگر بھی تلوار سونت کر باہر آگیا۔ اس نے اپنی محبوبہ کی لاش خون میں لت پت دیکھی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ پہرے دار سے الجھ پڑا۔ دونوں میں خون ریز لڑائی شروع ہو گئی۔ پہرے دار کو ایک عرصے سے تلوار بازی کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے وار اوچھے پڑ رہے تھے۔ سوداگر کو تلوار بازی کی بڑی مشق تھی۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر میں پہرے دار سپاہی کے سینے میں پوری کی پوری تلوار دستے تک اتار دی۔ ایک چیخ مار کر پہرے دار زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔ سوداگر نے اپنی محبوبہ الکنندہ کی لاش کو اپنی گود میں اٹھایا۔ وہ مر چکی تھی۔ سوداگر اس کے کھلے سیاہ بالوں میں

اپنا منہ چھپا کر رونے لگا۔ ادھر دو قتل ہوگئے تھے اور اُدھر شہزادہ اور ادہنی گھوڑوں کو بھگائے لئے جا رہے تھے وہ جلد از جلد اس راجہ کی مملکت سے نکل جانا چاہتے تھے۔ لیکن اب ایک اور مصیبت ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ اتفاق سے بڑا پجاری ادہنی کی کوٹھڑی میں آگیا۔ اس نے جو کوٹھڑی خالی اور ایک پہرے دار غائب دیکھا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پتا چلا کہ شہزادہ اور الکندہ بھی غائب ہے۔ اسی وقت تینوں پہرے داروں کی گردنیں اڑا دی گئیں اور پجاری اپنے ساتھیوں کو لے کر گھوڑوں پر سوار شہزادے اور ادہنی کے تعاقب میں نکل پڑا۔

## داستان کا انجام

عشق کے پروانے پر لگا کر اڑے چلے جا رہے تھے۔ رات نے اُن کے گرد اپنی سیاہ چادر پھیلا دی تھی۔ مگر انکے تعاقب میں آنے والے پجاریوں کی آنکھیں الو کی آنکھیں تھیں جو رات کے اندھیرے میں بھی دیکھ لیتی تھیں۔ پجاریوں کے پاس نیزے تھے۔ تلواریں تھیں اور تیر کمان تھے۔ بڑے پجاری کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس کی محبوبہ اُس سے جُدا کر کے اغوا کی جا رہی تھی بلکہ دیوتا اشر کی مقدس قربانی بھی تلف کی جا رہی تھی۔ یہ وقت وہ تھا کہ آسمان پر چاند کو گرہن لگنا شروع ہوگیا۔ راجہ قربانی کی رسم ادا کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اُسے خبر ملی شہزادہ دیوداسی ادہنی کو لے کر قید سے فرار ہوگیا ہے۔ اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ فرار ہونے والوں کا تعاقب کر کے انہیں مردہ یا زندہ اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ فوج کا ایک دستہ اسی وقت برق رفتار گھوڑوں پر سوار محبت کرنے والوں کی تلاش میں روانہ ہوگیا۔ یہ فوجی دستہ تھا۔ فوجی لوگ تھے۔ گھوڑے ہوا سے باتیں کرتے منزل مطلوب کی طرف بڑھنے لگے۔ اُدھر شہزادہ اور ادہنی گھوڑوں پر سوار اُڑے چلے جا رہے تھے۔ راستے کا علم ادہنی کو نہیں تھا لیکن شہزادے نے قافلوں کے ساتھ اس علاقے میں کئی بار سفر کیا تھا۔ رات کے وقت بھی راستے کی صحیح سمت سے آگاہ تھا۔ اس وقت چاند گہن سے باہر آچکا تھا اور آسمان پر اس کی روشنی پھیل گئی تھی۔ اس روشنی میں انہیں دُور تک پھیلے ہوئے اونچے نیچے میدان کی جھاڑیاں تک صاف نظر آ رہی تھیں۔

اب وہ راجہ کی سرحد سے باہر نکل چکے تھے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اب کسی دوسرے بادشاہ کی سرحد شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہ ویران اور گمنام علاقہ تھا اور یہاں بھی موہنجو داڑو کے راجہ کا ہی سکہ چلتا تھا۔ جس راستے پہ یہ دونوں محبت کرنے والے چلے جا رہے تھے وہ قافلوں کی رہ گزر تھی۔ ریت ہی ریت کے ٹیلوں اور کہیں کہیں ابھری ہوئی بھوری چٹانوں کے بیچ میں سے گزرتا ہوا یہ راستہ ویران تھا۔ کہیں کہیں کوئی درختوں کے جھنڈ آجاتے۔ ایک جگہ ادہنی نے گھوڑا روک لیا۔ شہزادہ اس کے قریب آگیا۔ اس نے رُکنے کی وجہ پوچھی۔ ادہنی نے کہا کہ وہ سفر کرتے کرتے تھک گئی ہے۔ اُسے گھوڑے پر مسلسل تیز رفتاری سے سفر کرنے کی عادت نہیں تھی۔ شہزادے نے اُسے گھوڑے سے اتار کر زمین پر بٹھا دیا اور مشکیزے میں سے تھوڑا سا پانی نکال کر پلایا۔ پانی پینے کے بعد ادہنی کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو اس نے شہزادے سے پوچھا کہ ابھی وہ کتنی دور نکل آئے ہیں۔ شہزادے نے مسکرا کر کہا۔

"ابھی تو ہم نے تھوڑا سا راستہ طے کیا ہے۔"

"تو کیا ہمیں ابھی ساری رات سفر کرنا ہوگا؟" ادہنی دیوداسی نے پوچھا۔

شہزادے نے کہا کہ ابھی انہیں تین راتیں اور چار دن سفر کرنا ہوگا۔ لیکن وہ راستے میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے آرام بھی کرتے جائیں گے۔ شہزادے نے ادہنی کا خوبصورت سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا اور اس کے بالوں میں بڑے پیار سے انگلیاں پھیرنے لگا۔ ادہنی نے آنکھیں بند کر لیں اور جیسے وہ خواب کی دنیا میں نکل گئی۔

شہزادے نے دیکھا کہ چاندنی میدان میں دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے گردن گھما کر اس علاقے کی طرف دیکھا جدھر سے وہ آ رہا تھا۔ اُسے دُور ایک سیاہ دھبہ سا دکھائی دیا۔ وہ سمجھا کہ یہ کوئی درختوں کا جھنڈ ہے جسے وہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ مگر جب اس نے غور کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ یہ سیاہ دھبہ آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا ہے۔ وہ چوکنا ہوگیا۔ اب دور اسے گھوڑوں کے سیاہ ہیولے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"ادہنی! وہ لوگ ہماری تلاش میں آگئے ہیں۔"

ادہنی بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے دیکھا کہ گھوڑ سوار کافی فاصلے پر ان کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ وہ بھی گھبرا گئی۔ شہزادے نے اسے حوصلہ دیا اور کہا کہ ہمارا بھاگنا بیکار ہے۔ میدان چاروں طرف سے کھلا ہے ہم جس طرف کو بھی بھاگے وہ دُور ہمیں دیکھ لیں گے اور تعاقب کر کے ہمیں گرفتار کر لیں گے۔ مرنا تو اب ہے ہی تو پھر کیوں نہ مرنے سے پہلے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے تاکہ دل میں کوئی حسرت تو باقی نہ رہے۔ ادہنی ڈر اور خوف سے سہم گئی تھی۔ مگر شہزادے کی باتوں نے اسے حوصلہ دیا اور وہ اس کے ساتھ لڑنے مرنے پہ تیار ہوگئی۔ وہاں کوئی رکاوٹ یا آڑ ایسی نہیں تھی جہاں یہ لوگ پناہ لے سکتے۔ اگر خندق کھود کر چھپ بھی جاتے تو گھوڑے ان کا راز فاش کر سکتے تھے۔ ادھر وہ خندق میں چھپ کر کتنی دیر تک دشمنوں پہ تیر برسا سکتے تھے۔ جب تیر ختم ہو جاتے تو ظاہر ہے دشمن کے سپاہی اُن پر ٹوٹ پڑتے اور ان کا کام بڑی آسانی سے تمام کر سکتے تھے۔ آخر شہزادے کو عافیت اسی میں دکھائی دی کہ جتنی جلدی ہو سکے گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں سے فرار ہوا جائے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ گھوڑوں کو ایڑ دکھائی اور ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ سپاہیوں کا دستہ بھی پجاری کی معیت میں اُن کے قریب آگیا تھا۔ انہوں نے مجرموں کو بھاگتے دیکھا تو گھوڑے ان کے پیچھے ڈال کر لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ شاہی اصطبل کے پلے ہوئے گھوڑے چشم زدن میں شہزادے اور ادہنی کے عقب میں پہنچ گئے۔ ادہنی نے چیخ مار کر کہا۔

"شہزادے! میرے محبوب! خدا حافظ۔ وہ لوگ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی تیروں کی ایک باڑ ان کے بھاگتے ہوئے گھوڑوں کے آس پاس آکر گری۔ دوسری باڑھ اُن کے بالکل سروں پہ سے گزر گئی۔ دشمن بہت قریب آگیا تھا۔ شہزادے نے ادہنی سے گھوڑا روکنے کو کہا۔

"ادہنی! میری محبوبہ! گھوڑا روک کر اس کی اوٹ میں لیٹ جاؤ۔ میں مقابلہ کروں گا۔ جب تک جان میں جان ہے تمہیں دشمنوں سے بچاؤں گا۔ جب مر گیا تو مجھے معاف کر دینا۔ یہ آسمان کے ستارے اور چاند گواہ رہیں گے میں تم سے محبت کرتا ہوا مرا تھا۔"

ابھی شہزادے نے اپنی بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ ایک تیر گھوڑے کے پیٹ میں آکر لگا اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ ادہنی اچھل کر دُور جا گری۔ شہزادے نے گھوڑا روکے قریب لے جا کر چھلانگ لگا دی اور اپنے گھوڑے کی اوٹ میں بیٹھ کر دشمن پہ تیر برسانے لگا۔ وہ ایک ایک تیر چلا رہا تھا جب کہ دشمن کی طرف سے تیروں کی بوچھاڑیں آ رہی تھیں اور دشمن کے سپاہی تیر برساتے ہوئے دونوں عاشق و معشوق کی طرف برابر بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ اس وقت ادہنی نے آنکھیں بند کر کے اور ہاتھ جوڑ کر دیوتا اشر سے دعا طلب کی کہ وہ انسان کی مدد کرے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی دعا کا فوری اثر ہوا اور

دریا کا دیوتا اُشر ان کی مدد کو بڑھا۔

اُن کے قریب ہی دریائے سندھ بہہ رہا تھا۔ اس دریا میں سے ایک بجلی کا شعلہ سا نکلا اور اوپر آسمان پر چابک بن کر لہرایا اور غائب ہوگیا۔ پجاری اور سپاہی اب شہزادے اور ادمنی کے سروں کے اوپر پہنچ چکے تھے اور ان پر تلواروں سے حملہ کرنے ہی والے تھے کہ یکایک آسمان پر بجلی زور سے کڑکی۔ سپاہیوں نے چونک کر آسمان کی طرف دیکھا وہاں کوئی بادل نہیں تھا۔ پھر یہ بجلی کہاں سے چمکی اور کڑکی تھی۔ ابھی وہ غور ہی کر رہے تھے کہ بجلی ایک بار پھر کڑکی۔ کڑک کے ساتھ ہی بجلی کی ایک آتشیں چابک سپاہیوں کے سروں کے اوپر آکر گری۔ بجلی نے گرتے ہی آدھے سپاہیوں کو جلا کر بھسم کر دیا۔ ان کے گھوڑے بھی جل کر سیاہ ہوگئے۔ کمال کی بات یہ تھی کہ اس بجلی نے شہزادے اور ادمنی پر کوئی اثر نہ کیا تھا۔ باقی سپاہی دہشت زدہ ہوگئے۔ پجاری نے چیخ کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں سپاہیو! یہ سب جادوگری ہے۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔"

لیکن ایک حقیقت تو ان کے سامنے تھی کہ ان کے آدھے سپاہی گھوڑوں سمیت جل کر خاک سیاہ ہوگئے تھے اور ان کی لاشیں سکڑی ہوئی میدان میں پڑی تھیں۔ بجلی ایک بار پھر کڑکی اور اس دفعہ باقی سپاہیوں کے سروں پر گری اور وہ بھی گھوڑوں سمیت بھسم ہوگئے۔ اب باقی بڑا پجاری اور اس کے ساتھی رہ گئے۔ بڑا پجاری حیرانی سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھی بولے۔

"مہاراج! دیوتا اُشر ہم سے ناراض ہے۔ اس نے بجلی کو حکم دیا ہے کہ وہ ہمیں جلا کر برباد کر دے۔"

پھر وہ گھوڑوں کو لے کر پیچھے کو بھاگے۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ بجلی کا کڑکا آسمان پر یک دفعہ پھر گونجا اور اُن سارے بھاگتے ہوئے پجاریوں پر بجلی شاخوں میں چھوٹ پھوٹ کر گری۔ آسمانی بجلی کے ایک ایک آتشی کوڑے نے ایک ایک پجاری کو راستے میں بھاگتے ہوئے جا لیا اور ان کے اوپر گر کر انہیں آگ کے انگاروں میں بدل کر پھر راکھ کی چٹکی بنا کر ہوا میں اڑا دیا۔ اب وہاں صرف بڑا پجاری رہ گیا تھا۔ شہزادہ اور ادمنی دیوداسی ایک دوسرے کے ساتھ لگے گھوڑے کی آڑ میں سے یہ حیران کن تماشہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ شہزادہ گھبرا رہا تھا کہ شاید اب بجلی ان کے اوپر گرے گی۔ لیکن ادمنی نے کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا میرے شہزادے! دیوتا اُشر نے ہماری غلطی کو معاف کر دیا ہے وہ ہمارے ملاپ پر خوش ہے۔ وہ پجاری کو اس کے گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔"

ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ بجلی چمکی۔ ایک کڑاکا پیدا ہوا اور بڑے پجاری کے سر پر ایک چابک سی لہرائی۔ وہ چکرا کر گرا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ بجلی اس کے سر کے اوپر سے ہو کر گزر گئی تھی۔ پجاری ایک طرف بھاگا۔ بجلی ایک بار پھر اُس کے سر کے اوپر کوندی مگر گری نہیں۔ بڑا پجاری زمین پر گر پڑا اور سجدہ ریز ہو کر بولا۔

"مجھے معاف کر دو اے مقدس دیوتا! میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔"

آسمان پر ایک زبردست گونج پیدا ہوئی اور پھر جیسے دیوتا اُشر کی ہیبت ناک آواز سنائی دی۔

"تمہیں معاف نہیں کیا جائے گا۔ تمہیں مارا بھی نہیں جائے گا۔ تم مر گئے تو تمہاری سزا ختم ہو جائے گی تمہیں ایسی سزا دی جائے گی جو ساری زندگی تمہارے ساتھ ایک عذاب بن کر چلے گی۔"

پجاری نے آگے بڑھ کر ادمنی دیوداسی کے آگے سر جھکا دیا۔

"اے مقدس دیوداسی! دیوتا اُشر کے آگے میری سفارش کر۔ میں تم سے بھی اپنی زیادتیوں اور گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں بے سمجھ تھا۔"

ادمنی نے کہا۔

"تم بے سمجھ نہیں تھے۔ تم بڑے ہوشیار اور مکار تھے۔ تم نے ساری زندگی میرے ساتھ ظلم کیا اور دیوتا اُشر کے نام پر ظلم کیا۔ یوں تم نے مقدس دیوتا کی بھی توہین کی۔ میں تمہیں معاف بھی کر دوں تو دیوتا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اس نے تمہیں آج تک کچھ نہیں کہا۔ لیکن اب تمہارے ظلم کی حد ہوگئی تھی۔ تم میری اور میرے شہزادے کی جان کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اب تمہیں سزا ملنی ہی چاہیئے تھی۔ تم نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا کہ تمہارے راجہ کی فوج کا کیا حال ہوا ہے۔ یہی حال تمہارے پجاریوں کا ہوا کہ دیوتا نے آسمانی بجلی بن کر انہیں جلا کر راکھ کر دیا۔ اب یہی حشر تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔ اپنے انجام کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جاؤ اپنے کئے کی سزا بھگتو۔"

پجاری گڑگڑاتا رہا اور ادمنی نے اس کی گڑگڑاہٹ پر کوئی کان نہ دھرا۔ عین اُسی وقت آسمان پر بجلی کوندی۔ ایک شعلہ سا لپکا اور اس نے بڑے پجاری کے سر پر ایک چکر سا لگانا شروع کر دیا۔ پجاری ڈر کر میدان کی طرف بھاگا۔ بجلی کے شعلے نے اس کا تعاقب کیا۔ جدھر پجاری جاتا شعلہ اسی طرف جاتا۔ آخر شعلے نے اُسے جا لیا۔ اور ایک بھیانک آواز کے ساتھ پجاری پر گرا اور اس کی ایک ٹانگ اور ایک بازو اڑا کر لے گیا۔ کمال کی بات یہ ہوئی تھی کہ پجاری کے خون کا ایک قطرہ نہیں بہا تھا۔ لیکن اس کی ایک ٹانگ اور ایک بازو پورے کا پورا غائب ہو چکا تھا۔ وہ زمین پر رینگ رہا تھا اور مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ اور وہاں اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ادمنی نے شہزادے کی طرف دیکھا۔ شہزادے نے ادمنی کو اپنے گھوڑے پر سوار کرایا۔ اور دونوں ہنسی خوشی شہر بابل کی طرف روانہ ہوگئے۔ کہانی بیان کرنے والا یہاں کہانی کو اس طرح سے ختم کرتا ہے کہ دیوتا نے اپنا بدلہ لے لیا۔ محبت کرنے والے مل گئے۔ شہزادے نے بابل میں جا کر ادمنی دیوداسی سے شادی کر لی اور وہ دونوں ہنسی خوشی اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔

اب تک ہم نے قدیم مصر، یونان اور موہنجو داڑو کے قدیم داستان گوؤں اور داستانوں کے بارے میں تفصیل سے اس لئے لکھا ہے تاکہ یہ نایاب نمونے اس روشن کتاب سیریز میں مدوّن ہو جائیں۔ کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کہانیاں اس سے پہلے اردو میں منتقل نہیں کی گئیں۔ ہو سکتا ہے لوگوں کی نظر سے یہ کتابیں گذری ہوں جن میں یہ کہانیاں اور اس کے بیان کرنے والوں کے حالات تفصیل سے درج ہیں لیکن ان کا ترجمہ کم از کم ہماری نظر سے نہیں گذرا اور ہم نے کسی بڑے سے بڑے اردو ادب کے نقاد کے مضمون میں بھی ان کے حوالے نہیں دیکھے۔ ویسے بھی ہماری اردو کی داستانوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ہمارے ہاں رواج ہے کہ ابتدا دو سو برس پہلے میر حسن محمد خیال کی قصہ گوئی اور بعد میں فورٹ ولیم کالج کے داستان طرازوں سے کی جاتی ہے۔ لیکن ہم نے داستان گوئی کی پوری تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا مکمل پس منظر بیان کر دیا ہے اور اُسے ضبط تحریر میں بھی لے آئے ہیں تاکہ آئندہ قدیم داستانوں پر تحقیق کرنے والوں کو نہ صرف یہ کہ مستند حوالے مل جائیں بلکہ انہیں آج سے پانچ ہزار سال پرانی

داستانوں اور داستان گوؤں کے انداز بیان کے صحیح نمونے بھی مل جائیں جنہیں ہم نے مغربی محققین کی مستند کتابوں سے ترجمہ کیا ہے۔ اب ہم واپس اپنی اردو کی داستان گوئی کی طرف آتے ہیں۔

## اردو ادب میں داستان گوئی

جیسا کہ ہم اس کتاب کے شروع میں بیان کر چکے ہیں اردو قصہ کہانی کی تاریخ دو سو برس سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اور تاریخی عمل میں دو سو برس کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ کوئی زیادہ لمبی مدت نہیں ہوتی۔ سید وقار عظیم اپنے ایک مضمون مطبوعہ نقوش ادب عالیہ نمبر میں لکھتے ہیں۔

"اردو داستان کے تصور کے ساتھ وہ سارے تصور جیتے جاگتے بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں جو صدیوں سے اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ انجمن آرائی اس کا مقصدِ اولیں ہے۔ وہ مریضوں کے لئے دوائے شفا اور غم نصیبوں کے لئے سرمایہ مسرت و شادمانی ہے۔ اسے اپنا مونس و غم خوار بنانے والے بے خودی و خود فراموشی کی آغوش میں پرورش پاتے اور ہر آن تازہ جہانوں کی سیر کرتے ہیں۔ بے خودی کی یہ دولت بے پایاں اس دنیا کا مقصود ہے جسے داستانوں نے اپنایا ہے۔ یہاں کے حقائق ہماری آپ کی دنیا کے حقائق سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں جن، دیو، پریاں آباد ہیں۔ یہ دنیا جادوگروں، نجومیوں، جوتشیوں، رمالوں کی دنیا ہے۔ اور یہ ساری مخلوق شاہوں، وزیروں، امیروں اور سوداگروں کی زندگی میں دوستی یا دشمنی کے رشتے سے منسلک ہے۔ یہاں کے جنوں، دیووں اور پریوں کی طرح یہاں کے انسان بھی عجیب الخلقت ہیں۔ حد درجہ خوب رُو اور حد درجہ بد وضع۔ حد درجہ نیک حد درجہ خیر کے مجسمے، شر کے پیکر، ہر چیز کی انتہا، ہر شے کی معراج، بلندی سے بلند اور پستی سے پست۔ ان سارے انسانوں کو رزم و بزم کے ایسے ایسے معرکے پیش آتے ہیں جو اس سے پہلے کسی انسان کے تصور میں بھی نہیں آئے تھے۔ یہ سارے معرکے سر ہوتے ہیں اور ان کا انجام ہمیشہ طرب و نشاط ہوتا ہے۔ یہاں غم عشق اور غم روزگار سے سابقہ بھی پڑے تو عشق کا نصب العین تائید غیبی سے، رہنمائی خضر سے، مشکل کشائی، دستگیری سے، اسم اعظم سے، لوح سے، تعویذ سے، سحر و تسخیر سے، اپنی بے مثال قوت بازو سے اسے بناتا اور شر کو روسیاہی کے سپرد کر کے خود سرخروئی اور کامرانی کا تاج سر پر رکھتا ہے اور انجام کاریوں داد عیش دیتا ہے کہ جو سنے جو پڑھے وہ تھوڑی دیر کے لئے ہی بھول جائے کہ دنیا میں غم ہیں، تلخیاں ہیں اور نامرادیاں ہیں ـــ داستانوں نے انسانوں کی دنیا کے سامنے اس عجیب دنیا کا تخیل پیش کر کے رنگینی، بوقلمونی، کشادگی، فراوانی، رفعت و عظمت کا مفہوم پیش کیا۔ بے بسوں اور محروموں سے ان کی بے بسی اور محرومی چھین لی ہے کہ بے خودی اور خود فراموشی کے لئے بھی بڑے انعام ہیں اور بے خودی کی دولت پر جتنا تصرف داستان کا ہے کسی اور چیز کا نہیں۔ اس کا شمار اعتنا ممکن نہیں۔ اسی سبب ہر زمانے میں اور ہر طبقے میں داستانیں محبوب و مرغوب رہی ہیں اور یہ دعوے کرتے وقت میرے سامنے اردو کی داستانوں کی پونے دو سو برس کی پوری تاریخ ہے۔"

کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے بہت پہلے اردو میں داستانیں سنائی جاتی تھیں اور لوگ ان داستانوں کو شوق سے سنتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ داستان سنانے والے بڑے کمال کے فن کار تھے۔ قدیم قصہ گوؤں کی طرح برصغیر پاک و ہند میں بھی ہمارے اردو کے اولیں داستان گو اپنے فن کے بڑے ممتاز اور ماہر فن کار تھے۔ انہوں نے فن داستان گوئی کو بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔ سرِ شام پائیں باغ میں چاندنی بچھ جاتی۔ گاؤ تکیے لگ جاتے۔ کہانی سننے والے بڑے شوق سے ایک طرف قطار میں لگ کر بیٹھ جاتے اور داستان گو بڑے دلچسپ اور دلنشیں انداز میں مناسب الفاظ اور برجستہ مکالموں کے ذریعے اپنی داستان کا آغاز کرتا۔ ۱۷۴۶ء سن کے شروع میں گجرات کا ٹھیاواڑ سے ایک داستان گو دہلی آگئے۔ یہ بہادر شاہ رنگیلے کا زمانہ تھا۔ مغلیہ سلطنت اپنے انجام کی طرف تیزی سے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور بادشاہ کی طرح لوگ بھی عیش پرستی اور تن آسانیوں میں پڑے تھے۔

یہ داستان گو دہلی شہر کے گلی کوچوں میں تلاش روزگار میں مارے مارے پھرتے رہے۔ جس مکان میں وہ رہتے تھے ان کے عقب میں ایک پرانا قہوہ خانہ تھا۔ یہاں لوگ سرِ شام جمع ہو کر گپ بازی کرتے تھے اور اسی جگہ کبھی کبھی بعض داستان گو فارسی میں پرانی داستانیں بھی سنایا کرتے تھے۔ میر تقی محمد خیال یعنی ہمارے اجنبی داستان گو نے بھی اس قہوہ خانے میں جانا شروع کر دیا۔ ایک روز محفل لگی تھی داستان گو کہانی سنا رہا تھا۔ لوگ دم بخود بیٹھے تھے۔ کہانی ختم ہوئی تو ایک صاحب نے کہا کہ یہ کہانی پہلے بھی سنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا کہ اس دور کے داستان گوؤں کو اگرچہ ہزاروں قصے یاد ہوا کرتے تھے۔ لیکن وہ سارے کے سارے قصے ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ یہ ساری کہانیاں ایران سے ہو کر اردو میں آئی تھیں اور ان میں طلسم ہوشربا کی بھی بے شمار کہانیاں تھیں۔ اس پر محمد تقی خیال کو خیال آیا کہ نئے قصے مرتب کرنے چاہئیں۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے ایک کہانی کا ابتدائیہ لکھ کر محفل میں سنایا جسے سامعین نے بے حد پسند کیا۔ دلی کے ایک داستان گو نے کہا کہ یہ کہانی تو فارسی میں ہے مزا تو جب ہے کہ قصہ اردو میں بنا کر لاؤ۔ خیال صاحب نے اردو میں داستانیں بیان کرنی شروع کر دیں۔ خیال طلسم ہوشربا میں سے داستانیں بھی سنایا کرتے تھے۔ دلی میں ان کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی۔ ان کی داستان سرائی کا ہر کوئی سکہ تسلیم کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ان کی شہرت نواب رشید الدین بہادر تک بھی پہنچ گئی۔ نواب نے خیال کو اپنے ہاں بلوا لیا۔ پھر انہوں نے اپنی وساطت سے خیال کو بادشاہ سے ملوایا۔ نواب صاحب کی فرمائش پر خیال نے بوستان خیال لکھنی شروع کی۔ بادشاہ نے کئی ایک زود نویس کاتب بٹھا دیئے۔ دوسری جلد مکمل ہوئی تو بادشاہ چل بسے۔ یہ سن ۱۷۴۸ء کا زمانہ تھا۔ یہاں سے محمد تقی خیال بنگال چلے گئے۔ وہاں نواب سراج الدولہ نے ان کی بہت پذیرائی کی اور ان کی ہی فرمائش پر خیال نے بوستان خیال کی پندرہ جلدیں مکمل کیں۔

## دلی میں داستان سرائی

دلی کی تاریخ اپنے اندر بذات خود ایک تاریخ ایک دور رکھتی ہے۔ اس تاریخ کے اوراق خون سے بھی لبریز ہیں اور ان اوراق کے ایوانوں میں سے ناؤ نوش اور سرود رقص کی صدائیں بھی بلند ہوتی ہیں۔ دلی کی ایک تہذیب ایک ثقافت تھی۔ یہاں جس پھول کی آبیاری شاہان مغلیہ نے کی تھی اس کی خوشبو اب شہر کے گلی کوچوں میں اڑ رہی تھی۔ یہاں کے باغات یہاں کے پرانے مقبرے اور اوراق مصور کی مثال گلی کوچے، اس وقت کے زندہ دلان دلی کے قہقہوں سے گونجا کرتے تھے۔ دہلی کے لوگوں میں بھی داستانیں سننے کا بڑا شوق تھا۔ اس زمانے میں داستانیں کہنے کا رواج اردو اور فارسی دونوں میں تھا۔ قہوہ خانے داستان گوؤں کی جنت تھی۔ یہاں سرِ شام چھڑکاؤ کر کے تخت بچھ جاتے جن پر چاندنی

بچھ کر گاؤ تکیے لگا دیئے جاتے۔ داستان سننے کے شوقین بڑے ادب سے، گرجیو جاتے۔ داستان گو داخل ہوتا تو خوشی سے خیر مقدم کیا جاتا اور جب وہ کہانی بیان کرنی شروع کرتا تو لوگوں پر گہرا سناٹا چھا جاتا۔

یہ شوق امیروں اور وزیروں کو بھی تھا۔ انہوں نے اپنے وسائل کی وجہ سے بعض مشہور اور پر اثر داستان گوؤں کو اپنے ہاں مستقل طور پر ملازم رکھا ہوا تھا۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ وہ رات کو ہر روز ایک نئی کہانی سنایا کریں۔ اس سے پہلے نئی کہانیوں کا رواج نہیں تھا۔ داستان گو وہی طلسم ہوشربا اور الف لیلےٰ کی کہانیوں کا ترجمہ کر کے سناتے۔ لیکن بعد میں طبع زاد داستانیں بھی سامنے آئیں۔ جو داستان گو سب سے اچھی طبع زاد کہانی سناتا اس کی زیادہ مانگ ہوتی وہ زیادہ لوگوں میں مشہور ہو جاتا۔ اس کی وجہ سے نقل کی حیثیت کچھ نہ رہی اور کہانی لکھنے والوں نے نئی نئی کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ اسی زمانے میں منظوم کہانیاں بھی لکھی گئیں۔ لوگ منظوم داستانوں کو بھی بڑے شوق سے سنتے تھے۔ وہ کہانی کے پلاٹ اور موزوں شعر، دونوں کا مزا لیتے تھے۔ دلی کے لوگ باذوق تو تھے ہی۔ یہی وجہ ہے کہ منظوم داستانیں بیان کرنے والوں کا بھی بڑا احترام ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ لوگوں کو نثر میں داستان سننے کی عادت پڑ گئی۔ چنانچہ داستان گوؤں نے نثر کے بیچ میں منظوم ٹکڑے لگانے شروع کر دیئے۔ جب لوگ اس سے کچھ بھرنے لگے تو پھر عبارت کہیں کہیں ہم قافیہ ہو گئی جو بعد میں اردو ڈرامے تک قائم رہی۔

پرانی داستانوں میں ترمیم و اضافہ بھی کیا جاتا۔ داستان گو اپنی طرف سے بھی کہانیوں میں بہت کچھ ڈال دیتے تھے۔ جس کا لوگ مزہ لیتے تھے۔ جتنا کوئی داستان گو پیچ دار بیان کا ماہر ہوتا اتنی ہی وہ مبالغہ آرائی کرتا۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو تحسین کی نوطرز مرصع کے بعد (۱۷۷۵ء) بہترین اور کلاسیکی داستانیں مرتب کی گئیں۔ ان میں میرامن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل اور طوطا کہانی اور خلیل علی خان اشک کی داستان امیر حمزہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے باہر بھی داستان نویسی پر بڑا کام ہوتا رہا۔ ایسے ایسے کمال کے قصے اور داستانیں لکھی گئیں کہ جن کی کہانیاں آج بھی برصغیر پاک و ہند میں معمولی سے ردوبدل کے ساتھ گھر گھر میں سنائی جاتی ہیں۔ ۱۸۰۱ء میں زرین نے باغ و بہار یا نوطرز مرصع قلمبند کی۔ انشاء اللہ خان انشا نے اپنی شہرۂ آفاق کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان لکھی۔ مجبور کی کہانی زرتن بے حد مشہور اور مقبول ہوئی۔ یہی وہ دور تھا جب اردو ادب میں داستان گوئی کی بطور ایک صنفِ ادب کے داغ بیل پڑی۔ ۱۸۲۴ء میں سرور نے فسانہ عجائب لکھی۔ گلزار سرور، شگوفہ محبت۔ شرر عشق۔ الف لیلہ۔ بوستان خیال۔ طلسم ہوش رُبا۔ داستان امیر حمزہ۔ طلسم نور افشاں۔ طلسم ہفت پیکر۔ سروش سخن اور طلسم حیرت کے علاوہ بے شمار تراجم، طبع زاد قصے اور کہانیاں معرض وجود میں آئیں جس نے داستان گوئی کی صنف کو پائیداری اور استحکام بخشا۔

پروفیسر وقار عظیم فرماتے ہیں۔

"اردو کے بیشتر اچھے داستان گو غدر سے پہلے اور غدر کے بعد تک دہلی، اودھ، رام پور، بنارس اور حیدرآباد دکن کے درباروں اور امیروں سے وابستہ رہے ہیں۔ اس تعلق اور وابستگی کے علاوہ شہروں میں داستان گوؤں کی مجلسوں کا عام دستور رہا ہے۔ جس میں داستان گو کبھی لکھ کر اور کبھی زبانی اپنی داستانیں سنا کر لوگوں کے دلوں کو مسرور کرتے اور ان سے ہدیہ تحسین و خراج عقیدت وصول کرتے رہے ہیں۔ اور دلی اور لکھنؤ نے اپنے زوال اور انحطاط کے زمانے میں بھی اپنی مجلسوں کو اس شمع سے روشن رکھا۔ چنانچہ دلی میں ۱۸۲۹ء تک

میر باقر علی داستان گو کی محفلیں مرجع خاص و عام تھیں اور لکھنؤ میں آج بھی عید کے دن داستانوں کے پرستار عیش باغ کے میدان میں میرزا ٹمن کی داستان سننے جاتے ہیں۔ یہ حالت تو بادشاہوں اور امیروں، وزیروں اور عامیوں کی تھی ــــــ

اب ذرا ایک جھلک ایسے ایسوں کی دیکھیئے جن کے ذوق کی نفاست اور لطافت ہر زمانے کے لوگوں کے لیے مثال اور نمونہ رہے گی۔ جمعرات کا دن ہے شام کے چھ بجے ہیں۔ غالب کے بلی ماران والے گھر میں بچوں اور بوڑھوں کی ایک محفل جمی ہوئی ہے۔ داستان پڑھی جا رہی ہے۔ اور سب شوق سے سن رہے ہیں۔ غالب میر محفل ہیں۔ داستان سنتے ہیں اور جہاں کہیں داستان گو مطالب کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا داستان کا سلسلہ اپنے ہاتھوں میں سے لیتے ہیں اور اسے مکمل کرتے ہیں اور خوش ہو ہو کر کہتے ہیں کہ دہلی کی زبان ان ہی داستان لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہے۔ داستان سے غالب کو جو گہری وابستگی تھی۔ اس کا اظہار اوّل تو گلزار سرور اور بوستان خیال کے دیباچوں سے ہوتا ہے اور دوسرے اس مزے دار خط سے جو انہوں نے میر مہدی مجروح کو لکھا تھا۔

بوستانِ خیال کے دیباچے کے دو تین جملے ملاحظہ ہوں۔

"افسانہ و داستان میں وہ کچھ سنو کہ کبھی کسی نے دیکھا نہ سنا ـــــ"

"ہر چند خردمند بیدار مغز تواریخ کی طرف بالطبع مائل ہوں گے لیکن قصہ کہانی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کے بھی دل سے قائل ہوں گے۔"

"داستان طرازی من جملہ فنونِ سخن ہے۔ سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لئے اچھا فن ہے ـــ"

غالب میر مہدی مجروح والے خط میں لکھتے ہیں۔

"میرزا غالب علیہ الرحمۃ ! ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی ایک کتاب امیر حمزہ کی داستان اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آ گئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادہ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں۔ رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔"

مختصر یہ کہ عوام اور خواص دونوں میں داستان سننے اور داستان پڑھنے کا شوق کسی نہ کسی انداز سے اب سے تقریباً دو سو برس سے قائم ہے۔ بیچ میں چند برس ایسے آئے تھے جب ناول اور مختصر افسانہ کے نئے فن نے داستانوں کو مختلف محفلوں سے نکال کر اس کی مسند پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اب پھر خواص ان داستانوں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ انہیں پڑھنے کے لئے وقت نکالا جاتا ہے۔ انہیں گفتگو اور تنقید کا موضوع بنایا جاتا ہے اور انہیں ایک نعمت غیر مترقبہ کی طرح کتب خانوں میں محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ داستان کہنے اور داستان لکھنے میں ہمیشہ سے بڑا گہرا ربط رہا ہے اور ہر زمانہ میں لوگوں کو داستان سننے اور داستان پڑھنے سے یکساں دلچسپی رہی ہے اور ہر زمانہ میں کہی اور لکھی جانے والی داستانوں میں تخیل کی کارفرمائی سب سے زیادہ رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ داستان کہنے اور لکھنے والوں نے مقامی ماحول اور مقامی مذاق سے متاثر ہو کر داستانوں میں داستان کی ساری خصوصیات برقرار رکھ کر بھی ان کے مضمون اور انداز میں جزوی تبدیلیاں کی ہیں۔ ان میں سے بعض فرق ارادی ہیں اور بعض غیر ارادی طور پر تحریروں میں داخل ہو گئے ہیں۔ فسانہ عجائب اس اثر کی بڑی نمایاں اور واضح مثال ہے اس قصہ میں ایک طرف تو سرور کی شخصیت نے داستان کی ترتیب و تشکیل میں نئے نئے

نقوش بنائے ہیں اور دوسری طرف لکھنوی معاشرت اور مذاق کے مخصوص انداز نے قصّہ کی تفصیلات میں امتیازی رنگ پیدا کئے ہیں یہی صورت ذرا کم تر طریق پہ باغ و بہار آرائش محفل اور بوستان خیال میں بھی موجود ہے لیکن دہلی اور لکھنؤ کی داستان گوئی اور داستان نویسی میں مقامی مذاق نے جو امتیازی فرق پیدا کئے ہیں۔ وہ داستانوں کے مضمون اور ان کی بیانی تفصیلوں سے زیادہ، انداز بیان میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جو داستان گو دہلی کے مذاق سے متاثر ہیں انہوں نے بیان میں سادگی، فصاحت اور سلاست کو اپنا شیوہ بنایا۔ اس کے مقابلے میں جن داستان گویوں پر لکھنوی ماحول اور مذاق کا اثر ہے اُن کے ہاں تصنع، رنگینی اور عبارت آرائی نمایاں ہے۔ طرز بیان کی ان منفرد اور امتیازی خصوصیات کے اظہار کے لئے بڑی آسانی سے میر امن کی باغ و بہار اور سرور کی فسانہ عجائب کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان دو کتابوں سے الگ بھی دہلی اور لکھنؤ کے داستان گویوں کی لکھی ہوئی جتنی داستانیں ہماری نظر کے سامنے ہیں وہ بھی مذاق کے اس نمایاں فرق کی مظہر ہیں۔ طلسم حیرت اور سرورش سخن جو میر امن اور سرور کی حمایت میں لکھی گئی ہیں، اس فرق کے دو اور امتیازی نمونے ہیں۔ لیکن اس فرق کا جو عکس بوستان خیال کے ترجموں میں ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور معنی خیز بھی"۔

## بوستان خیال کے بارے میں

کتاب بوستان خیال کا ترجمہ فارسی زبان سے کیا گیا۔ اس کتاب کی ۱۵ جلدیں ہیں۔

اس کا سب سے پہلا ترجمہ مرزا غالبؔ کے بھتیجے خواجہ امان دہلوی نے کیا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں کتاب بوستان خیال کے چوتھے اور تیسرے حصے کا ترجمہ کر کے غالبؔ کو دکھایا۔ غالبؔ نے اسے بہت پسند کیا اور اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا۔ خواجہ امان دہلوی کی ہمت افزائی ہوئی اور انہوں نے اس کتاب کی باقی جلدوں کا بھی فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا۔ لیکن افسوس کہ آخری جلد کا ترجمہ کرتے ہوئے وہ دل کے عارضے سے انتقال کر گئے آخری جلد کا باقی ترجمہ ان کے بیٹے قمرالدین خان راقم نے مکمل کیا۔ لکھنؤ میں بھی اس کتاب کے مختلف تراجم چھپے۔ ان کی مختلف جلدوں کے نام دہلی اور لکھنؤ میں الگ الگ رکھے گئے۔ لیکن سب جلدوں کو ملا کر اس کتاب کا مجموعی نام "بوستان خیال" ہی رہا۔ خواجہ امان دہلوی کا ترجمہ ۱۸۶۶ء میں چھپا۔ وہ دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"جس تحریر یا تقریر میں آورد اور ساختگی کا دخل ہوگا اور آورد بھی وہ کہ کوئی لفظ تکلف سے خالی نہ ہو لاریب وہ زبان اہل زبان کے نزدیک زبان عام ہے۔ اس طرح کی تک بندی اور زبان درازی ان ہی افسانوں کے واسطے لائق و خوشنما ہے جن کی تمہید ایسی ہوتی ہے کہ ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ ــــ نہ یہ قصّہ سر دفتر قصص۔ اگر احیاناً تصرفاً اس کے ترجمے میں سوائے بیان مصنف کے کچھ بھی جودت طبع کی جاتی حُسن قصّہ ہرگز باقی نہ رہتا۔ خاکسار نے ترجیح بیان و درازی زبان سے قطع کی اور اہل دہلی کے روزمرہ کا مقصد ہوا۔ لیکن وہ روزمرہ کہ جو خاص عامہ و اعزہ شہر کے بے تکلف و بلا تصنع استعمال میں ہے"۔

دوسری طرف مرزا محمد عسکری نے اس کتاب کے اپنے ترجمے کے دیباچے میں لکھا ہے۔ "عبارت رنگین۔ مقفیٰ و مسجع۔ فصاحت و بلاغت میں قلم توڑ دیتے ہیں۔ اشعار برجستہ اور حسب حال ایسی عمدہ طرز سے موقع و محل پر رکھے ہیں کہ سبحان اللہ ــــ اگرچہ خواجہ امان صاحب دہلوی نے بھی نہایت عمدہ ترجمہ فرمایا ہے۔ مگر جب اس ترجمہ کو ملاحظہ فرمائیں گے، فصاحت و بلاغت، لطفِ زبان نازک خیالی میں بدرجہا بڑھا ہوا پائیں گے"۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں تراجم میں سے ایک ایک نمونہ پیش کیا جائے تا کہ دونوں میں نمایاں فرق معلوم ہو سکے۔ سب سے پہلے دہلی سکول کے خواجہ امان دہلوی کے ترجمہ کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"راوی کہتا ہے کہ اس روز مرسلاق دیو پردہ قاف کو گیا تھا۔ تا نصف شب اپنے برادر خورد کے ہاں مہمان رہا۔ اس نابکار نے حیوانات سے قوی الجثہ اور شراب غلیظ سے اکثر دیوان قاف کی دعوت کی تھی۔ جب نصف شب گزری مرسلاق دیو اپنے بھائی سے خواہانِ اجازت ہوا اور کہا میں اس وقت پردۂ دنیا میں کسی کوہ پہ جاؤں گا اور شراب کے نشے میں اس آدم زاد کا نغمہ خوش سنوں گا ہر چند اس دیو مہمان دار نے کہا کہ یہ کیا وقت جانے کا ہے۔ مرسلاق دیو نہ مانا"۔

اب یہی ٹکڑا عبارت کا لکھنوی ترجمہ کی ملاحظہ ہو۔

"اب دو کلمے دیو کے عرض کئے جاتے ہیں کہ جب وہ حرامزادہ پُر غرلو یعنی مرسلاق دیو قاف میں گیا۔ اخوان الشیاطین میں سے ایک کا مہمان ہوا۔ سارا دن اور آدھی رات تک مرے ہوئے ہاتھی، ریچھ، سوُر، بلیاں، چوہے گھونس کھایا کیا۔ یا انگور میوے جو پُر آب . . . . . . . میں پڑے پڑے بغیر آتش جوش کھایا کئے تھے۔ جن میں تعفن سے بلے اٹھتے تھے ان کی شراب پیا کیا۔ نشہ میں یہ ترنگ سُوجھی کہ چلوں آدم زاد کا گانا سنوں۔ بھائی سے رخصت ہوا۔ چور کی طرح چلا۔

## کشمیر کا ایک البیلا داستان گو

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے بہت پہلے کشمیر میں ہمیں داستان کہنے کی روایات کا سراغ ملتا ہے۔

طامس مور کی مثنوی لالہ رُخ کا داستان گو رباب نواز شہزادہ اس روایت کی ایک کڑی ہے۔ لیکن اس کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے اندھیرے کی چادر تن گئی ہو۔ کشمیری ادب میں ہمیں بڑے مرتبے کے شاعر اور پرانے قصّے لکھنے والے ملتے ہیں لیکن داستان گویوں کا تذکرہ بہت کم پڑھنے میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں پنڈت ہرکشن پرشاد کول کی ایک ہندی کتاب کا انگریزی ترجمہ میری نظر سے گذرا ہے۔ اس کتاب کے انگریزی ترجمے کا نام "Valley of Stories" ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نام کے برعکس کتاب میں کشمیر کے بارے میں لکھی گئی پُرانے نثر نگاروں کی کہانیاں تو برائے نام ہیں مگر چند ایک پُرانے قصّہ گویوں کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ہماری اس کتاب کا مقصد چونکہ داستان گوئی کی پوری تاریخ کا جائزہ لینا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی اس وادی جنت نشان کشمیر کے بارے میں ذکر کیا جائے کہ اس سرو سمن زاروں کی وادی کے داستان گو اپنی کہانیوں میں کیا کیا گل کھلاتے تھے۔ پنجاب میں سکھوں کے راج سے بہت پہلے کشمیری ادب میں شاعری نے ایک باوقار مقام حاصل کر لیا تھا۔ اگرچہ یہ ساری شاعری تقریباً لوک کہانیوں پر ہی مشتمل تھی جو آریاؤں نے اس خطہ پُر بہار کو دی تھیں۔ چنانچہ کشمیر کی شروع شروع کی کہانیوں میں ہمیں ہندو دیو مالا کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ اس کے بعد جب برصغیر میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی اور کشمیر کے خطے میں بھی اسلام کا پرچم لہرایا تو یہاں کے ادب میں اسلامی اثرات نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ اگرچہ بزرگان دین اور صوفیۂ کرام کی کوششوں سے اس علاقے کو بھی اسلام کی شعاعیں بہت پہلے منور کر چکی تھیں۔ لیکن حکومت غیر مسلموں کے پاس تھی۔

کشمیر پر مسلمانوں کے تسلط کے بعد یہاں فارسی زبان کے عروج کا دور شروع ہوا اور ساتھ ہی ساتھ کشمیری شاعری میں دینی اور اسلامی روایات نے نفوذ کیا۔ ہم زیادہ تفصیل

میں جانے کے بجائے صرف کشمیری ادب کی صنفِ داستان گوئی تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ہمارا نقطۂ نظر زیادہ وضاحت سے سامنے آ سکے۔ اور اردو ادب کے طالب علم کو داستان گوئی کی صنف نثر پر پوری پوری معلومات مہیا ہو سکیں۔ پنڈت ہرکشن پرشاد کول کی کتاب کا ترجمہ کانپور کے کسی غیر معروف پریس نے آج سے ایک سو برس قبل چھاپا تھا۔ اس پر ترجمہ کرنے والے کا نام نہیں ہے۔ بیچے مترجم کی جگہ پنڈت ہرکشن پرشاد کول کا ہی نام لکھا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنڈت جی نے خود ہی اپنی ہندی کتاب کا ترجمہ کیا ہوگا۔

بہر حال وہ کشمیری داستان گویوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک البیلے اور رومانک کشمیری مسلمان داستان کہنے والے کا تذکرہ کرتے ہیں جس کا نام احد تھا اور جو وادیٔ کشمیر کے علاقے عبداللہ پور کا رہنے والا تھا۔ مصنف نے اس کشمیری داستان گو کے عہد کا سن کی وضاحت سے ذکر نہیں کیا۔ لیکن اس کی ایک اپنی لکھی ہوئی کہانی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ اورنگزیب کی حکومت کا آخری دور تھا۔ قیاس غالب ہے کہ اس داستان گو کی کہانیوں کو طامس مور نے بھی پڑھا ہوگا یا کسی سے ضرور سنا ہوگا۔ کیونکہ داستان گو احد کی زندگی کے واقعات اور کردار کی شوخی مثنوی لالہ رُخ کے ہیرو سے بہت مماثلت رکھتی ہے۔ جس طرح مثنوی لالہ رُخ کا شہزادہ رومانوی شہزادہ ہے اور داستان گو کا بھیس بدل کر ملکہ کے ساتھ ہو لیتا ہے بالکل اسی طرح بلکہ اس کے الٹ احد داستان گو اپنے زمانے کے ایک راجہ کی بیٹی کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے دربار میں بلخ کے بادشاہ کے شہزادے کے روپ میں پیش ہوتا ہے احد داستان گو کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس پر کبھی ڈان ژوان کا گمان ہوتا ہے کہ جو ہر لڑکی پر عاشق ہے اور جس پر ہر حسین لڑکی عاشق ہو جاتی ہے۔ کبھی وہ رابن ہڈ کے روپ میں سامنے آتا ہے کہ جو امیروں کا دشمن اور غریبوں کا ہمدرد ہے۔ وہ بے باک اور دلیر نوجوان ہے اور محبت کے معاملے میں بڑی سے بڑی رکاوٹ کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

اس کی اپنی زندگی دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ بیتے ہوئے ان گنت واقعات اور عشقیہ تجربات کو کہانیوں کی شکل دے رکھی تھی اور دوسروں کے نام سے سناتا تھا۔ پنڈت ہرکشن پرشاد کول نے بڑی تحقیق کے بعد یہ بات ثابت کی ہے کہ احد کشمیری کی زندگی میں وہ تمام واقعات گذرے تھے جو اس نے اپنی داستانوں میں بیان کئے ہیں۔ وہ ایک غریب کسان کا بیٹا تھا۔ عبداللہ پور میں پیدا ہوا۔ وہیں سیب کے باغوں اور زعفران کے کھیتوں میں کھیل کود کر بڑا ہوا۔ کہتے ہیں وہ بلا کا خوبصورت تھا۔ خوبصورتی کے ساتھ ہی ساتھ قدرت نے اُسے بلا کی ذہانت اور خود اعتمادی سے نوازا تھا۔ بچپن میں وہ جھوٹ اتنے اعتماد کے ساتھ بولتا تھا کہ لوگوں کو اس پر سچ کا گمان ہوتا تھا۔ یہی اثر انگیزی بعد میں اس کی داستان گوئی میں ظاہر ہوئی۔ کہتے ہیں جس مکان میں وہ رہتا تھا اس کے ساتھ ہی دریا بہتا تھا۔ دریا کی دوسری جانب راجہ کے محل کی فصیل تھی۔ اس فصیل میں ایک کھڑکی تھی۔ احد کاشمیری کبھی کبھی دریا کنارے بیٹھ کر مسلسل اس کھڑکی کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ دریا کنارے بیٹھا محل کی کھڑکی کو دیکھ رہا تھا کہ وہاں ایک حسین ترین لڑکی کا چہرہ نمودار ہوا۔ احد اس کے حسن سے بہت متاثر ہوا اور اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ دوسری طرف وہ لڑکی بھی احد کے مردانہ حسن و جمال سے بہت متاثر ہوئی۔ لیکن وہ بہت جلد وہاں سے بھاگ گئی۔

اب احد کے دل میں عشق کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ دن میں کئی بار دریا پر آکر بیٹھ جاتا اور مسلسل محل کی کھڑکی کو تکتا رہتا۔ اُسے وہ صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کئی روز گذر گئے۔ اُس کے دل میں آتشِ شوق نے طوفان مچا دیا۔ آخر ایک روز وہ رُخ زیبا دکھائی دیا۔ احد کشمیری پروانہ وار اپنی نظروں سے اس راجکماری کے حسین چہرے کی بلائیں لینے لگا۔

راجہ کی سب سے چھوٹی بیٹی راجکماری سنتھیا تھی۔ سنتھیا کی آنکھیں نیلی اور بال سنہری تھے۔ وہ حسن و جمال میں یکتا تھی۔ محل میں اُس کے حسن کا بڑا چرچا تھا اور اجنبین کا راجکمار اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن غریب احد کشمیری اس کے تیر نگاہ کا شکار ہو گیا۔ راجکماری بھی دور ہی دور سے اس سے محبت کرنے لگی۔ اب دونوں روزانہ ایک وقت پر دُور سے ملاقات کرتے احد کشمیری دریا کے کنارے پر سیب کے ایک درخت کے نیچے آکر کھڑا ہو جاتا۔ ٹھیک اسوقت محل کی کھڑکی کھلتی اور اس میں سے راجکماری سنتھیا کا خوبصورت چہرہ نمودار ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہتے اور اشاروں اشاروں میں باتیں کیا کرتے۔ احد نے کشمیری زبان میں راجکماری کے حسن کی تعریف میں ایک نظم لکھی۔ پنڈت ہرکشن پرشاد کول نے احد کشمیری کی اس کشمیری نظم کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ اس کے انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔

"راجکماری! تیرا چہرہ رات کو چاند کی طرح چمکتا ہے۔  
فصیل کے بادلوں میں سے جب کھڑکی کا پٹ کھلتا ہے تو تمہارا چہرہ چاند بن کر  
میری طرف دیکھتا ہے۔  
میں غریب کسان کا بیٹا احد تجھ سے پیار کرتا ہوں۔  
جس طرح ایک بے زبان چکور چاند سے پیار کرتا ہے  
چاند سے پیار کرنے والے چکور کا جو انجام ہوتا ہے میرا بھی ایک دن وہی انجام  
ہوگا۔"

نظم لکھنے کے بعد احد کشمیری کے دل میں ایک خیال رہنے لگا کہ کسی طرح سے یہ نظم راجکماری کو پہنچائی جائے۔ ایک روز اس نے دور سے راجکماری کو کاغذ پر لکھی ہوئی اپنی نظم دور سے دکھائی۔ راجکماری نے اُسے پریم پتر سمجھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اسے مجھے دے دو۔ احد کشمیری کے لئے اتنا اشارہ کافی تھا۔ وہ نظم پہنچانے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ مگر اس کی صورت بظاہر دکھائی نہ دیتی تھی۔ محل کے اندر وہ نہیں جا سکتا تھا۔ صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ کسی طرح سے دریا پار کر کے کھڑکی تک پہنچے اور اپنے دل کا حال راجکماری کے سپرد کرے۔ چنانچہ ایک روز اس نے گھر سے رسی کا گچھا لیا اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔ دریا کا پانی بر تاب تھا۔ مگر عشق کی گرمی کے آگے وہ کچھ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ احد دریا پار کر گیا اور سیدھا محل کی کھڑکی کے نیچے پہنچا۔ اس نے کمر کے گرد لپٹی ہوئی رسی اتار کر اُسے کھڑکی کی طرف اچھالا۔ اوپر سے راجکماری نے رسی پکڑ کر کھڑکی سے باندھ دی۔ نوجوان عاشق اوپر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی محبوبہ دلنواز کے روبرو تھا راجکماری نے دیکھا کہ اس کا محبوب اس کے خیال سے زیادہ حسین اور خوبرو ہے۔ احد کشمیری نے بھی دیکھا کہ راجکماری اس کے تصور سے بھی بڑھ کر حسین ہے۔

اس نے راجکماری کی تعریف میں لکھی ہوئی نظم پڑھ کر سنائی اور پھر اس کے حوالے کر دی۔ راجکماری اپنے حسن و جمال کی تعریف سن کر بے حد خوش ہوئی۔ اس نے اپنے بالوں میں لگا ہوا گلاب کا سُرخ پھول اتار کر اپنے محبوب کو پیش کیا۔ نوجوان عاشق نے پھول کو آنکھوں سے لگایا۔ اُسے چوما اور اپنی جیب میں چھپا لیا۔ یہ دو محبت کرنے والے دلوں کی پہلی ملاقات تھی۔ ابھی وہ جی بھر کر ایک دوسرے کو دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ پیچھے سے راجکماری کی نند نے اسے آواز دی اور وہ جلدی سے کھڑکی کے پٹ بند کر کے بھاگ گئی۔ کشمیری داستان گو نیچے اُتر آیا۔ اب اُسے سب سے زیادہ یہ فکر تھی کہ اوپر سے رسی کون کھولے گا۔ راز کے فاش ہو جانے کا خطرہ تھا۔ وہ دریا پار کر کے واپس کنارے پر آکر بیٹھ گیا اور رسی کو غور سے تکنے لگا۔ کافی دیر بعد راجکماری کھڑکی میں دوبارہ نمودار ہوئی اور

اس نے رسی کھول کر نیچے پھینک دی۔ جب شام کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تو احد ایک بار پھر دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر گیا اور رسی اٹھا کر لے آیا۔ اب ہر دم اس کی آنکھوں میں راجکماری کی تصویر رہنے لگی۔ اٹھتے بیٹھتے وہ اسی کے گن گانے لگا۔ وہ اس کی یاد میں شعر لکھ لکھ کر پھاڑ دیتا اور کاغذ دریا میں ڈال دیتا۔ کیونکہ راجکماری نے اُسے کہا تھا کہ وہ کبھی سے اس کے بارے میں ذکر نہ کرے وہ بدنام ہو جائے گی۔

یہاں پنڈت ہرکشن پرشاد کول لکھتے ہیں کہ افسوس کشمیری ادب کا ایک انمول خزانہ دریا کی لہروں کی نظر ہو گیا۔ احد کشمیری اگرچہ بنیادی طور پر آج ایک کشمیری داستان گو کی حیثیت سے تاریخ میں زندہ ہے مگر اُس کی شاعری کے چند ایک نمونے جہاں بھی دیکھنے کو ملے وہ ادبِ عالیہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ راجکماری کی محبت میں اس نے جو نظمیں کہیں وہ اس کے دلی جذبات کا عکس تھیں۔ خدا جانے وہ نظمیں اگر زندہ رہ جاتیں تو آج ان کا شمار دنیا کی بہترین عشقیہ نظموں میں ہوتا۔ لیکن آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ تاریخ ادب میں ایسے ایسے بہت ہوئے ہیں۔

راجکماری اور کشمیری نوجوان شاعر اور داستان گو احد کشمیری کی محبت بڑی خاموشی سے اندر ہی اندر پروان چڑھتی چلی گئی۔ وہ ہر روز ایک خاص معینہ وقت پر دور ہی دور سے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے اور جدا ہو جاتے۔ راجکماری کھڑکی کھول کر کھڑی ہو جاتی۔ احد دریا کے کنارے پر آ کر بیٹھ جاتا۔ کسی وقت وہ رسی لے کر جاتا اور کمند لگا کر راجکماری سے گھڑی دو گھڑی آمنے سامنے کی ملاقات کر کے واپس آ جاتا اور اس کے دل کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھتی۔ سردیوں میں جب برف پڑنے لگتی تو پھر احد گھر سے ٹھیک وقت پر نکل کر دریا کنارے آ جاتا۔ سخت سردی میں اس کے ہاتھ پیر ٹھٹھر رہے ہوتے۔ برف کے گالے اس کے سر پر پڑ رہے ہوتے لیکن وہ راجکماری کے انتظار میں محل کی کھڑکی کی طرف منہ کئے خاموش سیب کے درخت کے نیچے کھڑا رہتا۔ یہاں تک کہ راجکماری بھی کسی نہ کسی بہانے محل کی فصیل کی عقبی کھڑکی کھول کر اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔ دونوں ہاتھ ہلا کر ایک دوسرے کو سلام کرتے اور پھر چلے جاتے۔

ایک روز احد نے راجکماری سے کہا کہ وہ آدھی رات کو اس کے محل کے اندر اس سے ملنے آئے گا۔ راجکماری نے اُسے منع کیا کہ محل میں اس کا آنا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ وہ نہ آئے۔ لیکن نوجوان عاشق نہ مانا۔ آخر راجکماری نے ہار مان لی اور اسے کہا کہ وہ آدھی رات کو آ جائے وہ اس کا انتظار کرے گی۔ راجکماری نے کہا کہ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو وہ کھڑکی میں دیا جلا کر اسے اشارہ کر دے گی۔ اگر دیا نہ جلے تو وہ ہرگز وہاں آنے کی کوشش نہ کرے۔ احد کشمیری رات ہوتے ہی سیب کے درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ اس روز موسم بڑا خراب تھا۔ سردی شدت پر تھی اور ہلکی ہلکی برف گرنا شروع ہو گئی تھی۔ احد کشمیری سیب کے درخت کے نیچے سر پر کمبل اوڑھے بیٹھا راجکماری کی یاد میں ہولے ہولے عشقیہ شعر پڑھ رہا تھا۔ اسکی آنکھیں محل کی کھڑکی پر لگی تھیں۔ وہ برابر ٹکٹکی باندھے بند کھڑکی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے کھڑکی کھلی۔ مگر وہاں گہرا اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں احد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اُسے وہاں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے شروع شام ہی سے ایک تختہ لا کر دریا کنارے باندھ دیا تھا۔ وہ اس تختے کے ذریعے دریا پار کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر اچانک کھڑکی میں ننھا سا دیا ٹمٹمانے لگا۔

یہ دیا احد کے دل کے ایوانوں میں جگمگایا تھا۔ اس کی دنیائے محبت میں ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ اس کے چہرے پر سورج کی تمتماہٹ آ گئی۔ اس نے خوش ہو کر خدا کا شکر ادا کیا اور تختے پر بیٹھ کر اسے دوسرے کنارے کی طرف دھکیل دیا۔ پھر وہ لمبے ڈانڈ کی مدد سے دریا پار کرنے لگا۔ سردیوں کے موسم میں دریا میں پانی بہت کم ہو جاتا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے دریا پار کر لیا۔ دوسرے کنارے پر جا کر تختے کو ایک درخت کیسا تھ رسی سے باندھا اور محل کی دیوار کے نیچے جا کر کمند پھینکی۔ دو ایک بار کمند پھینکنے کے بعد راجکماری اُسے پکڑنے میں کامیاب ہو گئی۔ رسی اوپر کھڑکی کے ساتھ باندھ دی گئی اور احد کشمیری اوپر کھڑکی میں چڑھ گیا۔ وہ محل کے کمرے میں آ گیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ لیکن ننھے دیئے کی دھیمی روشنی میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی لکڑی کی بڑی بڑی الماریاں اور چھت کے ساتھ لٹکے ہوئے جھاڑ فانوس اسے نظر آ رہے تھے۔ اس نے راجکماری کو اپنی آغوش میں لے کر کہا۔

"راجکماری! تمہاری محبت مجھے سات سمندر پار سے بھی تمہارے پاس کھینچ لائے گی۔ لیکن میں ایک غریب کسان کا بیٹا ہوں۔ تمہاری محبت آسمان پر چمکتا ستارہ ہے۔ میں تمہاری محبت کے لائق نہیں ہوں۔ کیا تم مجھے ایک روز اپنی نظروں سے گرا تو نہیں دو گی؟"

راجکماری بھی اس کی محبت میں دیوانی ہو چکی تھی۔ وہ احد کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

"احد! میں راجکماری ہوں اور راجکماریاں کبھی جھوٹ نہیں بولا کرتیں۔ میں تم سے دل سے پیار کرتی ہوں اور زندگی کے آخری لمحوں تک تم سے پیار کرتی رہوں گی۔"

احد نے کہا۔

"میں مسلمان ہوں۔ تم ہندو برہمن ہو۔ ہماری تمہاری راہیں جُدا ہیں۔ ہم ساری زندگی ایک نہیں ہو سکتے۔ کیا تم مجھے کبھی چھوڑ کر بھلا تو نہیں دو گی؟"

راجکماری نے کہا۔

"احد سنو! محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ محبت کا اپنا الگ مذہب ہوتا ہے۔ دنیا والوں کے سامنے ہم دوسرے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن محبت کے دیوتا کے سامنے ہم ایک ہی مذہب کے پجاری ہیں۔ ہم ہمیشہ ایک رہیں گے۔ ہمیں دنیا کی کوئی طاقت الگ الگ نہیں کر سکے گی۔"

"احد نے کہا۔"

"اے اونچے محلوں میں رہنے والی راجکماری! دنیا والے ہمیں کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہونے دیں گے۔ وہ ہمیں ضرور ایک دوسرے سے الگ کر دیں گے۔ اگر تمہارے باپ کو پتا چل گیا کہ ایک غریب کسان کا مسلمان لڑکا اس کی راجکماری کو چھپ چھپ کر راتوں کو ملنے آتا ہے تو وہ تمہیں تو کچھ نہ کہے گا لیکن میرے سارے گھر والوں کو ہلاک کروا دے گا۔ اس کے باوجود میں تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ اگر تمہارے راجہ باپ نے مجھے کولہو میں ہی پلوا دیا تو میرے خون سے آخری دم تک تمہارے ہی نام کی آواز آتی رہے گی۔"

راجکماری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ احد نے اُسے اپنے گلے سے لگا لیا اور کہا۔

"تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا دل پھٹ رہا ہے۔ خدا کے لئے ان موتیوں کو یوں نہ بہاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہاری محبت میں زندہ رہوں گا اور تم سے ملتا رہوں گا۔ اگر مر بھی گیا تو میری روح آ کر تم سے ملاقات کیا کرے گی۔"

کھڑکی سے باہر آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی برف مسلسل گر رہی تھی۔ کھڑکی میں سے سرد ہوا کے جھونکے آ رہے تھے کہ اچانک محل کی راہداری میں کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ راجکماری نے جلدی سے پھونک مار کر دیا بجھا دیا اور احد سے سرگوشی میں کہا۔

"اس سامنے والی الماری کے پیچھے چھپ جاؤ۔ شاید میری نند آ رہی ہے۔"

نوجوان عاشق الماری کے پیچھے چھپ گیا۔ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ یہ راجکماری

کی ندھی۔ راجکماری نے دروازہ کھول دیا۔ نند اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں روشن شمع تھی۔ اس نے اندر آتے ہی کہا۔

"تم اسوقت کیوں جاگ رہی ہو؟"

راجکماری نے کہا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ دل گھبرا رہا تھا۔ اس لیے بستر سے اٹھ کر کھڑکی میں کھڑی ہو کر باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔"

نند بھی کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ راجکماری اور احمد کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کیونکہ کمند کی رسّی ابھی تک کھڑکی سے باہر لٹک رہی تھی۔ نند نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر جھانک کر دیکھا۔ اُسے کچھ راجکماری پر پہلے سے بھی شک تھا۔ وہ اُس کی دشمن تھی اور اپنے بھائی اُبھین کے راجکمار سے بیاہنا چاہتی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے رسّی نظر نہیں آرہی تھی۔ راجکماری نے کہا۔

"میا کھڑکی بند کر دو مجھے سردی لگ رہی ہے"

وہ بستر پر جا کر ریشمی لحاف اوڑھ کر کے لیٹ گئی تھی۔ نند نے پلٹ کر اس کی طرف اور پھر کمرے کی ایک ایک چیز پر مشکوک سی نظر دوڑائی۔ راجکماری نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگی کہ اے بھگوان میرے پیارے احمد کی جان بچا لینا۔ آخر نند شمع دان لے کر واپس چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی راجکماری نے دروازے پر کنڈی لگائی اور احمد کو الماری کے پیچھے سے باہر نکال کر کہا۔

"مصیبت چلی گئی ہے۔ اب تم چلے جاؤ۔ ایسے لگتا ہے اس چڑیل کو مجھ پر شک ہو گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے بھائی کو لے کر یہاں آجائے۔ تم فوراً واپس چلے جاؤ۔"

احمد نے کہا۔ "اب کب ملاقات ہوگی راجکماری؟"

راجکماری نے کہا۔

"میں تمہیں کھڑکی میں سے اشارہ کر دوں گی۔ تم ابھی انتظار کرو۔ بھگوان تمہاری حفاظت کرے۔"

"خدا حافظ! میری محبت کے شگوفے!"

احمد کشمیری کھڑکی میں لٹکی ہوئی رسی کے سہارے نیچے اُتر گیا۔ اس کے نیچے اُترتے ہی راجکماری نے رسّی کھول کر نیچے پھینک دی۔ احمد نے تختے کے ذریعے دریا پار کیا اور دوسرے کنارے پر آکر محل کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ راجکماری کا سایہ وہاں کھڑا اُسے ہاتھ ہلا کر الوداع کہہ رہا تھا۔ احمد نے بھی ہاتھ ہلا ہلا کر اس کو خدا حافظ کہا اور اپنے گھر آگیا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کے باپ نے اس سے پوچھا کہ وہ آدھی رات کو اتنی سخت سردی میں کہاں گیا ہوا تھا؟ احمد نے یونہی بہانہ بنایا کہ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

وقت گذرتا چلا گیا۔ احمد کا باپ بوڑھا ہو کر بیمار ہو گیا اور پھر کچھ روز بعد چل بسا۔ احمد کو اس کا بہت صدمہ ہوا۔ راجکماری کو بھی بہت افسوس ہوا۔ اب احمد کشمیری چھوٹی چھوٹی داستانیں دل ہی دل میں جوڑ کر اپنے ارد گرد کے لوگوں کو سنایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی دلچسپ کہانیوں اور سنانے کے انداز کی وجہ سے وہ قصبے میں مشہور ہو گیا۔ ہوتے ہوتے اس کی شہرت راجے کے محل تک بھی پہنچ گئی۔ ایک دن راجے نے اپنے منتری سے کہا کہ اس کو معلوم ہوا ہے کہ اس کی راجدھانی میں دریا پار کے ایک قصبے میں کوئی بڑا دلچسپ داستان گو رہتا ہے۔ ہم اس کی داستان سنیں گے۔ منتری نے اسی وقت سپاہی بھیج کر احمد کو بلا لیا۔ احمد صاف ستھرے کپڑے پہن کر ایک روز راجہ کے محل میں آگیا۔ راجہ نے اُسے اپنی خاص خواب گاہ میں طلب کیا تھا۔ اس کے پاس اس کی مہارانی اور دوسری راجکماریوں کے ساتھ راجکماری سنتیا بھی بیٹھی تھی۔ راجہ نے کہا۔

"احمد! ہم نے سنا ہے کہ تم بہت اچھی کہانیاں سناتے ہو ہمیں خوشی ہوگی اگر تم ہمیں بھی کوئی کہانی سناؤ گے؟"

احمد نے تعظیم سے جھک کر کہا۔

"مہاراج! یہ خاکسار اس قابل کہاں کہ آپ کے لائق کوئی کہانی سنائے۔ لیکن کوشش ضرور کروں گا کہ آپ کو ایسی کہانی سناؤں کہ آپ کے دل کو لگے۔"

اور پھر احمد کشمیری نے کنکھیوں سے راجکماری کو دیکھتے ہوئے ایک ایسے تاریخی راجہ کی کہانی سنائی جس کی مہارانی نے اس سے بے وفائی کر کے اس کے اکلوتے بیٹے کو باؤلی میں پھینک دیا اور پھر باؤلی کے کنارے بادام کا ایک درخت اُگا جس کی شاخوں میں چاندنی راتوں کو راجکمار کے قہقہوں کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ کہانی اس قدر پُر اثر اور دلگیر تھی کہ راجہ اور مہارانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کہانی سن کر بڑے متاثر ہوئے۔ انہوں نے احمد کشمیری کو بہت سا انعام و اکرام دیا اور کہا کہ وہ آج سے اُن کا خاص درباری داستانگو ہے۔

احمد کشمیری کو اور کیا چاہیئے تھا۔ اس طرح سے اُسے راجکماری کا قرب حاصل ہو جاتا تھا۔ وہ دربار میں ملازم ہو گیا۔ اُسے دربار کی طرف سے پچاس روپے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا۔ اس کا کام صرف اتنا تھا کہ جب کبھی راجہ کا دل چاہے اور وہ طلب کرے تو اسے کہانی سنائے۔ مہارانی خاص طور پر احمد کو بہت اچھا سمجھتی تھی۔ وہ اکثر اسے اپنے خاص محل میں بلا کر اس سے کہانی سنا کرتی۔ اُس وقت راجکماری بھی دوسری بہنوں کے ساتھ وہاں موجود ہوتی۔ احمد بڑے پُر تاثیر انداز میں کہانی بیان کرتا۔ سارے مجمع پر ایک جادو کا عالم چھا جاتا۔ ایک روز اس نے اپنی اور راجکماری کی محبت کی کہانی دوسرے ناموں سے سنا ڈالی کہ کس طرح ایک کسان کا لڑکا کسی راجے کی بیٹی سے پیار کرتا تھا اور اس سے چھپ چھپ کر ملنے راتوں محل میں آیا کرتا تھا۔ پھر ایک روز راجہ پر ان کی محبت کا راز فاش ہو گیا۔ راجہ نے کسان کے بیٹے کو گرفتار کر کے اُسے مست ہاتھی کے آگے ڈال دیا۔ راجکماری محل کی کھڑکی میں سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہی تھی اور اس سے محبت کرنیوالے غریب عاشق کو ہاتھی نے چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ یہاں احمد نے بڑے درد بھرے انداز میں کہا۔

"اور اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے راجکماری کی محبت کا جواب محبت سے دیا تھا!"

کہانی کچھ ایسے درد بھرے اور پُر اثر انداز میں بیان کی گئی تھی کہ مہارانی اور راجکماریوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ احمد کشمیری کی داستانوں میں بقول پنڈت کول ایک خاص بات ہمیں برصغیر کے داستان گوؤں سے مختلف دکھائی دیتی ہے اور وہ یہ کہ اس کی اکثر داستانوں کا انجام ٹریجڈی پر ہوتا ہے جب کہ ہمارے دوسرے داستان گویوں کی کہانیاں نغمہ طرب پر ختم ہوتی ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ احمد کشمیری کی کہانیوں میں بڑا اثر تھا اور وہ دل کی گہرائیوں میں جا کر اپنا گہرا نقش چھوڑ دیتی تھیں۔ کشمیری داستان گو کا خیال تھا کہ محل میں آکر وہ راجکماری کے قریب ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ اگرچہ وہ راجکماری کے قریب تھا مگر اُسے اس سے بات کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ راجکماری اُسے جب بھی ملتی مہارانی اور دوسری راجکماریوں کی معیت میں ملتی۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے اور خاموش ہو رہتے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ داستان گو احمد مہارانی کے محل کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر راجکماری پر پڑی۔ وہ اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہی تھی۔ راہداری میں ہلکا ہلکا اندھیرا

چھایا ہوا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا احد کشمیری نے آگے بڑھ کر راجکماری کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ راجکماری کا سانس اوپر کا اوپر رہ گیا۔ اس نے احد کو پہچان کر کہا۔

"احد! تم نے تو میری جان نکال دی۔ بھگوان کے لئے چلے جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو تمہاری کہانی کے غریب عاشق کا ہوا تھا۔"

احد نے کہا۔

"راجکماری! اگر تمہاری محبت میں مجھے ایک ہزار ایک بار بھی مست ہاتھیوں کے آگے ڈالا جائے تو میں تیار ہوں۔"

شی! ایسا نہ کہو!"

راجکماری نے اپنا ہاتھ احد کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ راجکماری کی انگلیوں سے زعفران کی مہک اٹھ رہی تھی۔ راجکماری کے ہاتھ پر احد کشمیری نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ عین اس وقت سامنے سے راجکماری کی نند نمودار ہوئی۔ اس نے دونوں کو اس حالت میں دیکھا تو وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ راجکماری اور احد جلدی سے الگ ہو گئے۔ راجکماری کا رنگ زرد ہو گیا اور وہ زمین میں گڑ گئی۔ احد جلدی سے وہاں سے بھاگ گیا۔ نند نے راجکماری سے صرف اتنا کہا۔

"تمہیں شرم سے ڈوب مرنا چاہیئے تھا۔"

راجکماری سر جھکائے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ احد کشمیری کو معلوم تھا کہ اب اس کی خیر نہیں ہے۔ اس نے بڑی عقلمندی سے کام لیا اور اسی وقت محل سے نکل کر دریا پار کر کے اپنے گھر آیا۔ گھر میں وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ گھر بند پڑا تھا۔ اس نے اپنے پرانے صندوق میں سے کمبل نکال کر اسے کندھے پر ڈالا اور شام کے اندھیرے میں کشمیر کے جنگل میں ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ راجہ کے سپاہی اس کے گھر آتے ہیں یا نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ راجہ کے سپاہیوں کا ایک دستہ گھوڑوں پر سوار وہاں آیا اور انہوں نے احد کشمیری کے گھر کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ گھر کی ساری تلاشی لی گئی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ گھر کو آگ لگا دی گئی۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ احد درختوں میں چھپا اپنے پرانے گھر کو آگ کے شعلوں میں دھڑا دھڑ جلتا دیکھتا رہا اور دل میں خون کے آنسو روتا رہا۔ اگر وہ وہاں موجود ہوتا تو سپاہی اسے ہرگز زندہ نہ چھوڑتے۔ اسے کاٹ کر اس کے گھر کی آگ میں ہی پھینک دیتے۔

سپاہی واپس چلے گئے۔ اس وقت احد کو خیال آیا کہ خدا جانے راجکماری پر کیا گذر رہی ہوگی۔ ضرور اس پر بھی ظلم ہو رہا ہوگا۔ اب اس کے لئے وہاں رہنا بہت خطرناک بات تھی۔ وہ اس ملک سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ راجہ کے سپاہی ساری وادی میں اس کی تلاش میں گھوم رہے ہوں گے۔ سرحدوں پر بھی نگرانی کی جا رہی ہوگی۔ پھر وہ کیا کرے؟ اسے اپنے دوست مراد کا خیال آگیا۔ وہ رات کے اندھیرے میں جنگل جنگل چلتا مراد کے گھر پہنچ گیا۔ اس کا گھر پہاڑی کی ترائی میں تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو مراد باہر نکل آیا۔ احد کو دیکھ کر اس نے اسے گلے لگا لیا اور بولا۔

"سپاہی تمہاری تلاش میں یہاں بھی آئے تھے۔ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ تم اگر میرے گھر میں رہے تو گرفتار ہو جاؤ گے۔ کیونکہ سپاہی پھر یہاں آئیں گے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

مراد اسے اپنے ساتھ لے کر ایک پہاڑ کی ویران سی کھوہ میں لے گیا۔

"تم یہاں کچھ دن رہو۔ تمہیں کھانے پینے کی ہر شے میں یہاں پہنچا دیا کروں گا۔ جوں ہی ذرا حالات اچھے ہوئے تمہیں وادی سے نکال دوں گا۔ فکر نہ کرو۔"

ساری رات اور دوسرا دن بھی احد نے اسی کھوہ میں بسر کیا۔ دن میں ایک بار مراد آیا اور اسے کھانے پینے کو دے کر چلا گیا۔ دوسرے دن وہ اس کے لئے دودھ اور سیب لیکر آیا تو اس نے بتایا کہ راجکماری کی چپکے چپکے اجین کے راجکمار سے شادی کر دی گئی ہے اور وہ اجین چلی گئی ہے۔ احد کے دل میں جیسے ایک تیر سا لگا۔ اس نے مراد سے کہا۔

"میرے دوست! اب میرا یہاں زندہ رہنا بیکار ہے۔ جہاں میری راجکماری گئی ہے وہیں میں بھی جاؤں گا۔"

مراد نے کہا۔

"کچھ عقل سے کام لو احد! تم ایک غریب آدمی ہو۔ اور پھر اب ایک شاہی مجرم ہو۔ تمہارے سر کی قیمت راجہ نے مقرر کر دی ہے۔ تمہارا اور راجکماری کا کیا جوڑ بھلا؟ اس بات کو دل سے بھلا دو۔ میں تمہیں یہاں سے کسی نہ کسی طرح نکال دوں گا۔ تم ملک ایران چلے جاؤ۔ وہاں میرا ایک چچا سوداگری کرتا ہے۔ میں اس کے نام ایک خط دے دوں گا۔ وہ تمہیں وہاں ضرور کوئی روزگار دلا دے گا۔ وہاں رہ کر تمہاری جان بھی بچ جائے گی اور تم زندگی بھی آرام سے بسر کرو گے۔"

احد نے کہا۔ تمہارا شکریہ مراد! میں ایران نہیں جاؤں گا۔ میں راجکماری کے شہر اجین جاؤں گا۔ تم مجھے یہاں سے نکال دو۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھلاؤں گا۔"

مراد سمجھ گیا کہ احد کے سر پر عشق کا بھوت سوار ہے اور وہ کسی کے سمجھائے نہیں سمجھے گا۔ ایک ہفتے کے بعد آدھی رات کو وہ پہاڑ کی کھوہ میں آیا اور احد کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی گھاٹیوں اور تنگ دشوار گذار علاقوں میں سفر کرنے لگا۔ ساری رات وہ پہاڑوں میں سفر کرتے رہے۔ مراد ان سارے راستوں سے خوب واقف تھا۔ دوسرے دن بھی وہ سفر کرتے رہے۔ شام کو انہوں نے تھوڑی دیر آرام کیا اور آدھی رات کے بعد پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔ صبح ہوئی تو وہ کشمیر کی سرحدوں سے دور نکل چکے تھے۔ یہ علاقہ شمال مغربی ہندوستان کا علاقہ تھا۔ یہاں سے دریائے جہلم دو پہاڑوں کے بیچ میں سے ہو کر گذرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ علاقہ ضرور آج کا پاکستان ہوگا۔ یہاں مراد اپنے دوست احد سے جدا ہو گیا۔ احد کے پاس اتنی رقم موجود تھی کہ وہ بڑی آسانی سے کسی قافلے کے ساتھ مل کر اجین کی طرف جا سکتا تھا۔ وہ جہلم شہر کی ایک کارواں سرائے میں آگیا۔ یہاں وہ سارا دن اور ساری رات رہا۔ یہاں سے ایک قافلہ دلی کی طرف جا رہا تھا۔ احد اس قافلے میں شریک ہو گیا۔ کئی روز کی مسافت کے بعد وہ دلی پہنچ گیا۔ دلی اس کے لئے ایک اجنبی شہر تھا۔ یہاں کی کارواں سرائے میں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ اجین کو ایک قافلہ دس روز کے بعد آدھی رات کو روانہ ہوگا۔ داستان گو احد کے پاس سوائے انتظار کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

کارواں سرائے میں وہ ہر شب لوگوں کو داستانیں سناتا۔ اس کی داستان گوئی کی وہاں دھوم مچ گئی۔ لوگ شہر سے بھی اٹھ اٹھ کر کارواں سرائے میں آتے اور احد کشمیری کی داستانیں سنتے۔ ایک رات جب کہ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ اس نے لوگوں کو اپنی زندگی کی اصل کہانی یعنی راجکماری کی داستان محبت داستان بنا کر سنا دی۔ انجام اس کا بھی ٹریجڈی ہی تھا۔ یعنی انجام کار راجہ غریب عاشق کو ہاتھیوں سے چروا دیتا ہے۔ کہانی جب انجام پر پہنچی تو سارے کے سارے سامعین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ داستان گو احد خود بھی رو رہا تھا۔ مجمع پر ایک عجیب رقت کا عالم طاری تھا۔ کتنی دیر تک وہاں ایک گہرا سناٹا طاری رہا۔ پھر ایک عورت نے اس خاموشی کی مہر کو توڑ کر کہا۔

"اے نوجوان داستان گو! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان نہیں ہے بلکہ تمہاری آپ بیتی ہے۔ کیا ایسا ہوا تھا؟

کشیری داستان گو نے کہا۔

"میری بہن! اگر ایسا ہوا ہوتا تو آج میں کہانی سنانے کے لئے تمہارے سامنے زندہ نہ ہوتا۔"

خاتون بولی۔ خدا نہ کرے کہ تمہارے ساتھ ایسا ہو۔ مگر یہ کہانی تمہاری اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ خدا تمہیں بُری نظر سے بچائے۔"

آخر وہ رات آگئی جب قافلہ اجین کی طرف روانہ ہوا۔ نوجوان کشمیری داستان گو ایک ڈاچی پر سوار تھا جس کے گلے میں چاندی کی گھنٹیاں بندھی تھیں۔ اُسے اس کی مترنم آواز میں راجکماری کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آدھی رات کے بعد قافلہ شہر سے باہر نکلا تو چاندنی رات میں گرد و نواح کے گھنے تاریک جنگل میں سے مہندی کی جھاڑیوں کی خوشبو آئی۔ داستان گو کی آنکھوں میں آنسو آگئے اُسے راجکماری کی انگلیوں سے اُٹھنے والی زعفران کی مہک یاد آگئی۔ ساری رات قافلہ سفر کرتا رہا۔ دوسرے روز سپیدہ صبح نمودار ہوا تو دُور سے اُجین شہر کی فصیل اور شاہی محل کی مرمریں چھتریاں نظر آئیں۔ اپنی اونٹنی پر بیٹھے بیٹھے داستان گو کے دل سے درد کی ایک لہر سی اٹھی۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ یہی وہ محل ہے جس کی چار دیواری میں اُس کی محبت قید ہے۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہوا کہ کم از کم اسی فضا میں اس کی محبوبہ بھی تو سانس لے رہی ہوگی۔ قافلہ کارواں سرائے میں ٹھہر گیا۔ داستان گو سارا دن اجین شہر کے گلی کوچوں اور خوبصورت باغوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ وہ محل کی طرف نہیں گیا۔ اس خیال سے کہ کہیں اُسے کوئی پہچان نہ لے۔ شام کو وہ کارواں سرائے میں آکر لیٹ گیا۔

اسی کارواں سرائے میں اُس نے اپنی روزی کمانے کے لئے داستان گوئی کا کام شروع کر دیا۔ اُس کی داستان گوئی نے وہاں آگ لگا دی۔ اس فن میں اُسے بے حد مہارت حاصل تھی اور اس کے پاس سنانے کے لئے بے شمار درد بھری اور دل پر اثر کرنے والی کہانیاں تھیں۔ وہ کچھ اس انداز سے داستان سناتا کہ سننے والے دم بخود اور مبہوت ہو کر رہ جاتے۔ شہر میں اس کی شہرت کا نقارہ گونجنے لگا۔ شہر کے امرا تک یہ خبر پہنچی کہ شہر میں ایک کمال کا داستان گو آیا ہے تو احد کو امرا کے ایوانوں میں بھی طلب کیا جانے لگا۔ ہوتے ہوتے یہ خبر راجہ تک بھی پہنچ گئی۔ راجکماری دل تھام کر رہ گئی۔ آخر اس کا عاشق اس کی تلاش میں وہاں بھی پہنچ گیا تھا۔ کشمیری داستان گو کو راجہ نے دربار میں طلب کیا۔ شام کو شاہی محل کے ایوانِ خاص میں محفل سجی اور کشمیری داستان گو نے کھڑے ہو کر کہانی سنانی شروع کی۔ وہ کبھی چل پھر کر کہانی سناتا۔ کبھی ایک دم بیٹھ جاتا اور کبھی کرداروں کے انداز میں اداکاری شروع کر دیتا۔ ساری محفل دم بخود تھی۔ اس سے بڑھ کر اور احد کو کیا چاہیئے تھا۔ اس کی محبوبہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ لیکن ایک صدمہ اس کے دل میں تیر بن کر کھبا تھا کہ اس کا رقیب یعنی راجکماری کا شادہ شدہ راجکمار بھی سامنے براجمان تھا۔ شاید اسی رقابت کی وجہ سے ہمارے کشمیری داستان گو کی زبان میں بلا کی تیزی آگئی تھی۔ اس کی زبان تلوار کی مانند کاٹ کر رہی تھی۔ کہانی ختم ہو گئی۔ محفل پر ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ راجہ نے کشمیری داستان گو کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ والیٔ کشمیر کے دربار میں سے وہاں کوئی نہ تھا جو کشمیری داستان گو کو پہچان سکتا۔ احد نے اُجین کے محل میں رہنا شروع کر دیا۔

ایک روز وہ آدھی رات کو راجکماری کے محل میں جا پہنچا۔ وہ باہر بالکونی میں آگئی۔ اس نے روتے ہوئے داستان گو کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔ یہاں کسی کو ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا اور اس کے ساتھ وہ بھی برباد ہو جائے گی۔ داستان گو نے جب یہ محسوس کیا کہ اب اُس کی محبت اور محبوبہ کی عزت کا سوال ہے تو وہ محل سے اسی وقت باہر نکل آیا۔ اُس نے اُجین کے دربار کو خیرباد کہہ دیا اور مدراس کی طرف نکل گیا۔ وہاں وہ کئی مہینوں تک مختلف مندروں اور پہاڑوں میں گھومتا رہا پھر حیدرآباد چلا آیا۔ یہاں اس نے ایک امیر کے ہاں نوکری کر لی۔ اس نے داستان گوئی ترک کر دی تھی اور امیر کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے پر ملازم تھا۔ ایک رات امیر کے ہاں اُجین کے کچھ امرا مہمان ٹھہرے۔ انہوں نے کشمیری داستان گو کو پہچان لیا۔ امیر کو جب معلوم ہوا کہ اس کا ملازم تو بلا کا داستان گو ہے تو اس نے اس سے کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ شام کو محفل سجائی گئی۔ چاندنی بچھ گئی۔ گاؤ تکیے لگا دیئے گئے۔ کشمیری داستان گو نے بہت انکار کیا مگر امیر نے اُسے کہانی سنانے پر مجبور کر دیا۔ کہانی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ اُجین سے آنے والے امیروں کی زبانی باتوں ہی باتوں میں کشمیری داستان گو کو یہ بُری خبر معلوم ہوئی کہ راجکماری کچھ روز بیمار رہ کر چل بسی ہے۔ وہ گم سم سا ہو کر رہ گیا۔ اسی حالت میں اس نے بھری مجلس میں اپنا بایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور اپنی زندگی کی آخری داستان شروع کی۔

یہ کہانی اس کی اپنی کہانی تھی۔ یہ کہانی اس کی آپ بیتی تھی۔ اور ایک ایسے کشمیری نوجوان کی داستان تھی جس کو ایک راجکماری سے محبت ہو گئی۔ جو آدھی رات کو چھپ چھپ کر اس سے ملا کرتا تھا۔ کہانی شروع رہی۔ داستان جاری رہی۔ شمع جلتی رہی۔ پروانے اس پر نثار ہوتے رہے۔ حاضرینِ مجلس دم بخود بیٹھے اس جادوگر داستان گو کی زبان سے لفظوں کے پھول جھڑتے اور خون کے قطرے ٹپکتے دیکھتے رہے۔ کہانی آہستہ آہستہ اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی۔ محفل میں ہر کوئی کشمیری داستان گو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج اس کی زبان اور اس کے بیان میں خدا جانے کیا جادو تھا کہ در و دیوار ساکت و ہمہ تن گوش اس کی داستان کو سن رہے تھے۔ اور پھر داستان گو نے کہانی کا انجام بیان کرتے ہوئے کہا کہ راجکماری کے غم میں اس کا مجبور عاشق اُس سے آخری ملاقات کرنے محل میں گیا تو پکڑا گیا اور اُسے سب کے سامنے آگ کے شعلوں میں زندہ ڈال دیا گیا۔ کہانی کے اس مقام پر پہنچ کر کہتے ہیں کہ کشمیری داستان گو نے اپنا ہاتھ شمع کی طرف بڑھایا اور اس کے شعلے سے اپنے کپڑوں میں آگ لگا دی۔ مجلس میں بیٹھے سامعین ہکا بکا ہو کر دیکھتے رہ گئے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا تھا کہ یہ سب کچھ اچانک کیا ہو گیا۔ جب وہ اٹھ کر بدنصیب کشمیری داستان گو کی طرف بڑھے تو اس وقت تک وہ شعلوں کی تپش سے بے ہوش ہو کر گر چکا تھا۔ اسی رات وہ انتقال کر گیا اور اس کی آخری وصیت کے مطابق اسے کشمیر کی وادی میں دفن کر دیا گیا۔ پنڈت کول کے بیان کے مطابق اس گم نام اور آتش نوا البیلے کشمیری داستان گو کی قبر کا سراغ آج تک نہ مل سکا۔

قارئین کرام! یہاں ہم اپنی سلسلہ وار کتاب کا اردو نثر کے اصناف کے سلسلے میں صنف داستان گوئی کو تمام کرتے ہیں۔ اس سے اگلی کتاب (اردو ادب کی داستان) کے تیسرے حصے میں ہم اُردو نثر کی دوسری اہم اصناف مثلاً ڈراما۔ افسانہ۔ سوانح۔ سفرنامہ اور رپورتاژ کے بارے میں تفصیل سے لکھیں گے۔

○